جواہرات

امین سلونوی

جواہرات

مجموعہ

آل انڈیا مشاعرہ - اجلاس چہل و نہم انڈین نیشنل کانگریس لکھنؤ

سنہ ۱۹۳۶ء

مرتبہ

امین سلونوی

(مطبوعہ نامی پریس لکھنؤ)

قیمت تین روپے

بار دوم

فہرست

نظمیات

عرضِ مُرتّب

ارادہ تھا کہ اُردو ادب کی اس تاریخی دستاویز "جواہرات" کو ۱۹۵۷ء کے صد سالہ جشنِ آزادی کے موقع پر دوبارہ پیش کیا جائے۔ لیکن یہ اس وقت ممکن نہ ہو سکا کیونکہ حکومت اتر پردیش کا نظامت اطلاعات خود "قومی شاعری کے سو سال" کے عنوان سے آزادی کی نظموں کا ایک مجموعہ تیار کر رہا تھا اور اگرچہ "قومی شاعری کے سو سال" کی ترتیب میں جواہرات سے بھی مدد لی گئی۔

"جواہرات" ایک ایسے مشاعرہ کی نظموں کا مجموعہ ہے جو اس اہم دور کی یادگار ہے جب جنگ آزادی ایک نئے محاذ پر پہنچ گئی تھی یہ وہ دَور تھا جب سیاسی تاریخ کا ایک دروازہ بند ہو رہا تھا اور دوسرا ایک نئے انداز سے کھل رہا تھا۔ کانگریس کی جنگ آزادی کے سلسلہ کی مختلف تحریکات سے کم از کم تیس سال سے میرا بھی اس حیثیت سے تعلق رہا ہے کہ کانگریس پلیٹ فارم سے وقتاً فوقتاً قومی مشاعروں کی تنظیم و انعقاد کی خدمات میرے سپرد ہوتی رہیں اور آج بھی یومِ آزادی۔ یومِ جمہوریہ۔ گاندھی جینتی اور دوسری ترقیاتی اسکیموں کے مواقع پر بھی یہ خدمت وابستہ ہی ہے اسی لئے "جواہرات" کی دوبارہ اشاعت کا خیال میرے دل میں برابر جاگزیں رہا۔ اس خیال کو اس وجہ سے اور بھی تقویت پہنچی کہ ادب دوستوں نے جواہرات کی دوبارہ اشاعت پر اصرار کرنا شروع کیا اور اب کی مرتبہ تو میرے کرم فرما عزت مآب حافظ محمد ابراہیم صاحب وزیر آبپاشی اور بجلی مرکزی حکومت نے بھی اس کو یادگار کے طور پر چھاپنے کی خواہش ظاہر کی کیونکہ اسکے نسخے نایاب ہو چکے تھے۔ آخرکار میں نے نظامت طلاعات کے علم و ادب نواز ڈائرکٹر شری بھگوتی شرن سنگھ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور انھوں نے حسبِ دستور میری ہمت افزائی کی اور میری اس خواہش کی تکمیل میں پوری مدد کا وعدہ فرمایا اور میں اس قابل ہو سکا کہ اس تاریخی دستاویز کو دوبارہ پیش کر سکوں۔

خادم ادب

امین سلونوی

لکھنؤ

پیشِ لفظ

۱۹۳۶ء کا اجلاس کانگریس جو لکھنؤ میں منعقد ہوا وہ کئی حیثیتوں سے اہم تھا۔ سیاسی اعتبار سے ایک نیا دور جنم لینے والا ہی تھا اور نئی سیاسی اصلاحات کے بعد صوبوں میں خود مختار حکومتوں کے قیام کے لئے زمین ہموار ہو رہی تھی۔ اُدھر ادبی ثقافتی محاذ پر بھی نئی نئی تحریکیں اُبھر رہی تھیں اور ترقی پسند تحریک وجود میں آ رہی تھی اور اسے پنڈت جواہر لال نہرو اور اچاریہ نریندر دیو جیسی شخصیتوں کی حمایت حاصل ہو چکی تھی۔ اردو زبان جو پہلے ہی سے قومی تحریک کی ہمنوائی میں پیش پیش تھی اس زمانے کے تمام تقضیات اور محرکات کی پوری طرح آئینہ داری کر رہی تھی۔ اس لئے یہ فطری تھا کہ اردو کے جس اہم مرکز یعنی لکھنؤ میں کانگریس منعقد ہو رہی تھی وہاں اس موقع پر کوئی یادگار ادبی اجتماع بھی ایسا ہوتا جو قوم پرور عناصر کے خیالات کی ادبی ترجمانی کرتا۔

فطرت کی یہ آواز لکھنؤ والوں نے سُنی اور وہاں کے زندہ دلان ادب نے، جن میں **آنند نرائن ملا**، **امین سلونوی**، **حکیم آشفتہ لکھنوی مرحوم**، **وصل بلگرامی مرحوم** وغیرہ پیش پیش تھے، ایک کُل ہند قومی مشاعرے کے انعقاد کا فیصلہ کر ڈالا۔ شرط یہ تھی کہ مشاعرے میں قومی موضوعات سے متعلق نظمیں پڑھی جائیں جن لوگوں کو کل ہند مشاعروں کے نظم کرنے کا اتفاق ہوا ہے وہ ان دشواریوں کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں جو منتظمین کو ہندوستان بھر سے متحد الخیال ادبا اور شعراء کو ایک مرکز پر جمع کرنے میں پیش آتی ہوں گی۔ لیکن یہ زیادہ تر امین صاحب کی انتھک کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے گوشے گوشے سے قوم پرور شاعر ڈھونڈھ نکالے اور سب کو اس تقریب کے لئے یکجا کر لیا۔ افتتاح کے لئے انھوں نے **بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو** کو آمادہ کر لیا۔ فارسی اور اردو سے

مرحومہ کو جو لگاؤ تھا اور ہندوستانی سیاست میں وہ جس بلند مرتبے کی مالک تھیں ان کے پیش نظر ان سے زیادہ موزوں ہستی کوئی ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ جو لوگ اس مشاعرے میں شریک تھے ان کی نظروں میں اس کامیاب اجتماع کی تصویر آج بھی پھر رہی ہوگی۔ جو لوگ شریک نہ ہو سکے ان کے لئے آئین سلونوی نے تمام شعرا کا کلام کتابی صورت میں جواہرات کے نام سے اسی زمانے میں شایع کرا دیا تھا۔ اب اس یادگار مشاعرے کی یاد کو دوبارہ تازہ کرنے کے لئے وہ جواہرات کا دوسرا ایڈیشن بھی شایع کر رہے ہیں۔

جواہرات صرف ایک مشاعرے کی روئداد نہیں ہے بلکہ اس دور کی قومی شاعری کے متنوع تقاضوں کی بڑی حد تک نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اگرچہ شعرا کی ایک ایک نظم یا ایک ایک غزل سے ادبی رجحانات پر بحث کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن ایسی کئی نظموں کے یکجا ہو جانے سے اس کتاب کا اپنا ایک مزاج بن گیا ہے۔ قوم پروری اور وطن دوستی کا جذبہ جب تک عام انسانیت کے تقاضوں کے برعکس متضاد فضا پیدا نہیں کرتا اس وقت تک وہ ایک صالح جذبہ رہتا ہے جس کا مقصد ناجائز بندشوں کو توڑنا، پستی و پس ماندگی کو دور کرنا اور ترقی کے جادوں پر تیزی سے گامزن ہوتا ہے۔ یہ جذبہ شاعری اور ادب میں مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے اس تنوع میں شاعروں کے انفرادی رجحانات کو بھی بڑا دخل ہے اور اس کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر بھی ہے کہ شاعر کی وطن پروری صرف خیالی اور ذہنی ہے یا اس میں عملی سیاسی زندگی سے بھی کچھ تجربات اور محسوسات سمٹے ہیں۔

پھر بھی یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ ۱۹۳۶ء تک قومیت اور وطن پرستی پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج تھی اور اس مجموعے کو دیکھ کر خوشی ضرور ہوتی ہے کہ سیاسی محرومی اور سامراجی تشدد کے اس دور میں بھی اردو کے شاعروں کی صف میں ایسی اچھی خاصی تعداد ان وطن پروروں کی تھی جو حق کی بات زبان پر لانے میں جھجکتے نہیں تھے اور جو وطنیت کا نعرۂ مستانہ بلند کرتے وقت اس بات کو نظر انداز کر دیا کرتے تھے کہ اس کا نتیجہ زنجیر دوستی بھی ہو سکتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مجھے پوری اُمید ہے کہ جواہرات کا یہ دوسرا ایڈیشن بھی پہلے ایڈیشن کی طرح مقبول ہوگا۔

سری نگر

۱۰؍جولائی ۱۹۵۹ء

علی جوّاد زیدی

جواہرات کی اشاعت ثانیہ

از علامہ نیاز فتحپوری

۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۱ء تک کا زمانہ یوں تو صرف ۲۵ سال کا زمانہ ہے لیکن اس مختصر زمانہ میں ہندوستان کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ قوموں کی تاریخ میں اس کی مثالیں ہم کو بہت کم ملتی ہیں۔

دمید دانہ و بالید و آشیانگہ شد

۱۹۳۵ء تک کانگرس اپنے جلسے ملک کے درجنوں گوشوں میں کر چکی تھی، لیکن ۱۹۳۶ء کا اجلاس لکھنؤ خاص اہمیت کا حامل تھا۔ کیونکہ یہ وقت تھا جب ملک کا مطالبۂ آزادی اپنی رقیق حالت چھوڑ کر ایک سانچہ میں ڈھلنے والا تھا اور خودمختار صوبائی حکومتوں کی داغ بیل پڑ رہی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس وقت ملک میں ایک عام کیفیت جوش کی پیدا ہونا چاہئے تھی اور ہوئی۔ یہاں تک کہ ہمارا طبقۂ شعراء بھی چونکا اور تقریب حصول آزادی میں ایک آل انڈیا مشاعرہ کی تحریک نے عملی صورت اختیار کر کے تمام شعراء کا کلام جواہرات کے عنوان سے شائع کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ یہ اجتماع ادبی و سیاسی دونوں حیثیتوں سے بڑا اہم اجتماع تھا، کیونکہ ملک کے تمام چوٹی کے شعراء نے اس میں حصہ لیا اور حصول آزادی کی تمناؤں کو ہر ممکن نفسیاتی پہلو سے پیش کر کے دل و دماغ میں خاص گرمی پیدا کر دی۔

ہرچند ملک اب آزاد ہو چکا ہے اپنا مقصد عظیم حاصل کر چکا ہے اور اس کے قوائے ذہنی عملی صورت اختیار کر رہے ہیں لیکن اس لحاظ سے کہ زخموں کو تازہ رکھنا ہی قومی حیات کا راز ہے، ضرورت ہے کہ عہد تمنا کا فسانہ بار بار دہرایا جائے — اور ماضی کی چونکا دینے والی ساعتوں کو فراموش نہ کیا جائے — یہی مقصد ہے جواہرات کی اشاعت ثانیہ کا اور اسی کے ساتھ یہ جذبہ بھی کارفرما ہے کہ ہمارے وہ رفقاء و شعراء جو اُس وقت تھے اور اب نہیں ہیں ان کی یاد بھی تازہ ہو جائے اور یہ ہدیۂ اعتراف ان آسودگان خاک تک پہنچا دیا جائے۔

پیش کش

سنہ ۱۹۳۶ء کے یادگار قومی مشاعرہ کا مجموعہ "جواہرات"

جسے پنڈت جواہر لال نہرو کے نام نامی سے نسبت ہے

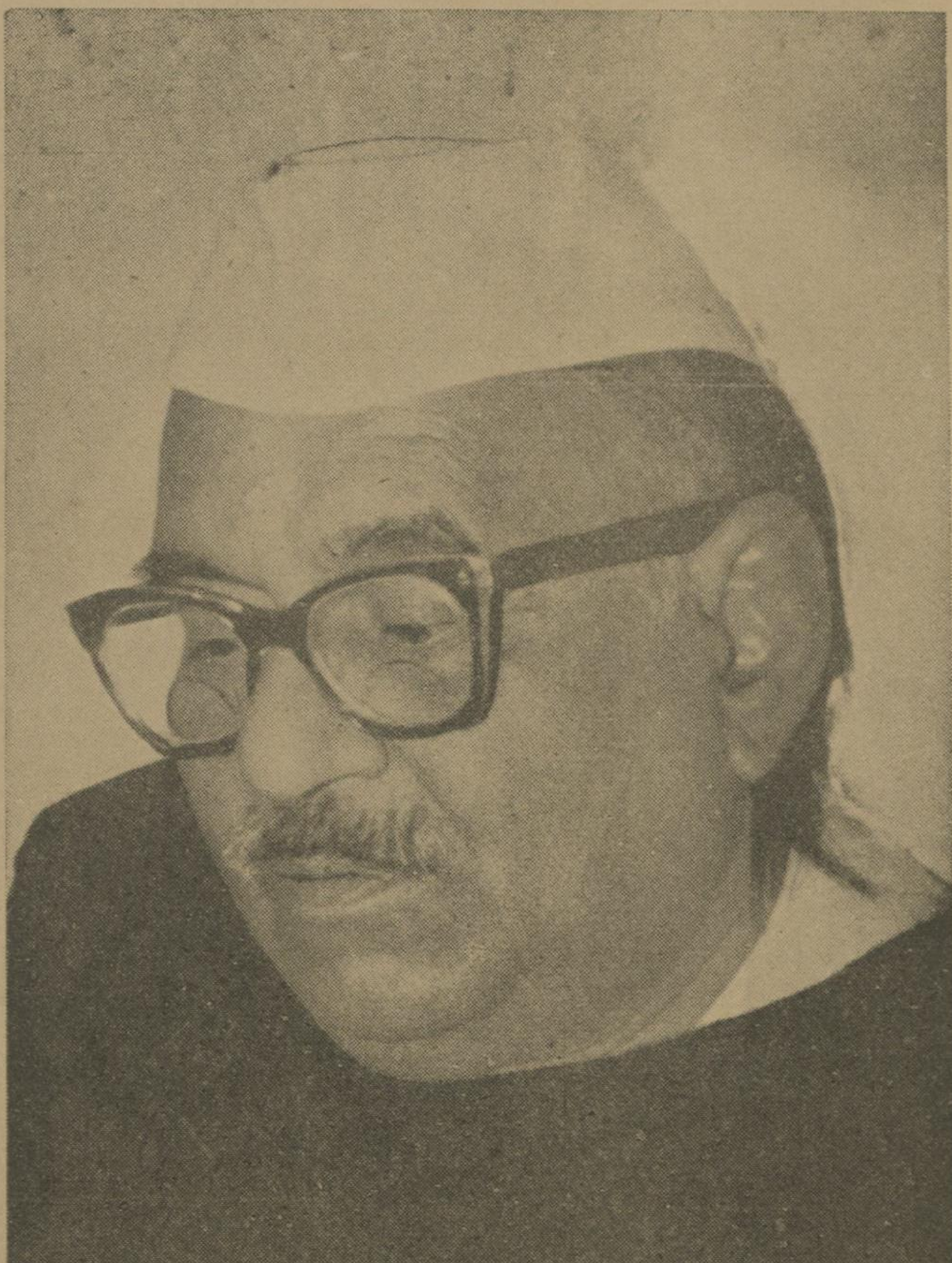
اور جو جدو جہد آزادی کی ایک ادبی اور تاریخی دستاویز ہے

آج میں اپنے ملک کے پختہ کار سیاستدان جنگ آزادی کے ایک رہنما

مفکر فلسفی۔ ادیب اور شاعر ڈاکٹر سمپورنانند وزیر اعلیٰ اتر پردیش

کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں۔

امین سلونوی



ڈاکٹر سمپورنا نند وزیر اعلیٰ اتر پردیش

خطبۂ صدر مجلس استقبالیہ

صدرِ محترمہ! شعرائے باکمال!! خواتین و حضرات!!!

مجھے اس بات پر فخر و مسرت ہے کہ آل انڈیا مشاعرہ کی استقبالیہ کمیٹی نے مجھے اپنا صدر منتخب کیا، اور اس اہم موقع پر مجھے اس کا اہل سمجھا کہ میں فرائض صدارت انجام دوں۔

مجھے اپنی بے بضاعتی اور نا اہلی کا اعتراف ہے، لیکن وہ کون ذرّہ ہے جسکو ذرّہ نوازی بُری معلوم ہوتی ہے اور میرے دل میں اُس خلوص و محبت کا احساس ہے جس کی بنا پر میرے احباب نے میری عزت افزائی کی اور یہ اہم خدمت سپرد کی۔

بحیثیت صدر استقبالیہ میرا سب سے پہلا اور سب سے زائد خوشگوار فرض صدر محترمہ کی خدمت میں ہدیۂ سپاس پیش کرتا ہے۔

مسز سروجنی نائڈو کی سیاسی اور ادبی خدمات سے کون شخص واقف نہیں ہے اور اگر کوئی بدنصیب ایسا ہے تو یقیناً وہ ہندوستانی کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

مسز نائڈو اس تاریک دَور کی اُن چند ہستیوں میں ہیں، جنکی وجہ سے ملک میں کچھ اجالا سا معلوم ہوتا ہے، اور جن کی زندگی تاریخ وطن کا ایک زریں باب بن چکی ہے۔ اُن کی عدیم الفرصتی ظاہر ہے۔ اور مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ انھوں نے ہماری دعوتِ صدارت قبول فرما کر اس مشاعرہ کو ہمیشہ کے لئے ایک ادبی یادگار بنا دیا، اور اُردو ادب کو مرہونِ احسان کیا۔

اُس کے بعد مجھے اپنے اُن معزز اور باکمال مہمانوں کے جذبہ وطن پرستی کا اعتراف

کرتا ہے جس نے اُنھیں ہمارے مشاعرے کے دعوت نامہ کو قبول کرنے پر مجبور کردیا
جس وقت کہ دعوت نامے روانہ کئے گئے تھے اُس وقت مجھے یہ اُمید نہ تھی کہ اس موقع پر اتنی
باکمال ہستیاں یکجا ہو جائیں گی۔ اور اس مشاعرے کو اتنی ادبی عظمت حاصل ہوگی میں
بخوبی سمجھتا ہوں کہ یہ شاندار اجتماع میری دعوت پر نہیں ہوا ہے، بلکہ یہ قوم کا مطالبہ تھا جسکو
غیرت مند دل رد نہ کرسکے ہیں جملہ شعراء کا صدق دل سے ممنت گزار ہوں اور اُمید
کرتا ہوں کہ وہ میری اور استقبالیہ کمیٹی کی اُن کوتاہیوں پر نظر نہ کریں گے جو اُن کی خاطر اور
مہماں نوازی میں یقیناً ہم سے سرزد ہوئی ہیں۔

یہاں پر میں اراکین مشاعرہ کمیٹی کی بے نیازانہ خدمات کا بھی اعتراف کرنا چاہتا ہوں
جس نے ہماری سعی کو کامیاب بنایا۔ جناب امین سلونوی کی جسقدر شکرگزاری کیجائے
کم ہے۔ اُنھوں نے اپنے جملہ اوقات خواب بیداری اس کام پر نذر کردیے اور اس کے آگے
اپنے کسی نجی کام کا کبھی خیال نہ کیا۔ جناب وصل بلگرامی نے اپنا کافی قیمتی وقت اس کام
میں صرف کیا اور باوجود ناسازی طبیعت ہر طرح کی امداد دی۔ دیگر اراکین کی گرانقدر
مشاورت بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔

حضرات! میں اس موقع پر کوئی طویل خطبہ پیش کرکے آپ کا عزیز وقت ضائع نہ
کروں گا لیکن خوش قسمتی سے چونکہ مجھ کو آج ایسا موقع نصیب ہوا ہے، میں اپنے معزز مہمانوں
کی خدمت میں دو باتیں عرض کروں گا۔ اور مجھے اُمید ہے کہ وہ ناگوار خاطر نہ ہوں گی۔

غالباً اس کلیہ سے تو کوئی انکار نہ کرے گا، کہ شاعری کا بہترین موضوع محبت ہے۔
اور محبت کا نفیس ترین عنصر ایثار ہے اگر یہ دو باتیں تسلیم کرلیجائیں تو بجز چند خدارسیدہ حضرات
کے کسی کو یہ ماننے میں تامل نہ ہوگا کہ محبت کا اعلیٰ ترین درجہ وطن کی محبت ہے میں شعراء کی خدمت



پنڈت جواہر لال نہرو (وزیر آعظم ہندوستان)
صدر آل انڈیا کانگریس ۱۹۳۶ع

میں بکمالِ ادب عرض کروں گا، کہ کیا اس جذبہ کے ماتحت وہ لطافتیں اور وہ نزاکتیں پیدا نہیں ہوتیں جن کو محسوس کرنیکے لئے ایک مشتعل دل کی ضرورت ہے؟۔ کیا اس جذبہ سے وہ قلبی کیفیات پیدا نہیں ہوتیں، جو کہ شاعری کی جان ہیں؟۔ اور اگر ہوتی ہیں، تو کیا یہ غلط ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ شعرائے اردو نے عام طور پر اس جذبہ سے متاثر ہونے میں کوتاہی کی ہے۔ انھوں نے اپنے ماحول کا وہ اثر نہیں لیا ہے، جو کہ انھیں لینا چاہئے تھا۔ مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں نہایت مسرت ہے کہ کچھ ہستیاں ایسی ہیں جو دردِ قومی سے بے خبر نہیں ہیں۔ میں جناب جوش ملیح آبادی۔ جناب سیماب اکبر آبادی۔ جناب ساغر نظامی جناب روش صدیقی جناب فیاض گوالیاری اور جناب بسمل الہ آبادی کے جذبۂ وطن پرستی کا معترف ہوں لیکن ان کے علاوہ آج اور بھی بہت سی باکمال ہستیاں ہیں جن پر اردو ادب بجا طور پر ناز کرتا ہے اور جن کی بنا پر میں یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ موجودہ دور کسی دورِ ماضی سے ادبی وقار میں کم نہیں ہے۔ میں ان شعراء سے گزارش کروں گا کہ وطن بھی ان کی نگاہ توجہ کا مستحق ہے میں یہ گستاخی نہیں کروں گا کہ ان سے یہ عرض کروں کہ آپ دل پر ایک مصنوعی جذبہ طاری کر کے شعر کہئے میں ان سے یہ عرض کرونگا کہ یہ غیر ممکن ہے کہ جو آپ کے ایسے حساس دل رکھتے ہیں ان کے دل میں یہ فطری جذبہ پیدا نہ ہوتا ہو آپ اس کی آواز پر توجہ نہیں کرتے اور اسکو دل ہی دل میں دبا دیتے ہیں۔ للہ ایسا نہ کیجئے۔ اس آواز کو بلند ہونے دیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ یہ ایک نغمۂ بے پناہ بن جاتی ہے کہ نہیں؟۔

شاعری کا اعلیٰ ترین منصب قوم اور ملک کی بیداری ہے۔ ملک جس نازک دور سے گزر رہا ہے وہ ہر شخص پر عیاں ہے۔ وطن کے ہر گوشہ میں حصول آزادی کیلئے ایک خاموش جہاد جاری ہے۔ اس جہاد میں ہر قدم پر ایثار اور نفس کشی کی ضرورت ہے۔ کیا اس جہاد میں حصہ

لینا آپ کا فرض نہیں ہے؟ کیا قوم کا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچانیکے لئے آپ سے بہتر کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے؟ کیا آپ کو اس سے زیادہ کوئی عزت حاصل ہو سکتی ہے کہ آپکے اشعار اس جدوجہد میں فنکاران وطن کی زبان پر ہوں؟ جب اس پر کوئی نازک وقت آئے تو اُنکے مجروح دل اُن سے تسکین پائیں؟ اور جب اُن کے ارادوں میں کوئی تزلزل واقع ہو تو آپکے اشعار اُن کو غیرت دلائیں؟ ہاں اس شاعری سے یہ تو ضرور ہوگا کہ کوئی خطاب سرکاری آپ کو نہیں ملے گا، کوئی تمغہ آپکے سینے پر آویزاں نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کی اولاد آپکو مورث تسلیم کرتے ہوئے اپنے ہمچشموں میں شرمسار کبھی نہ ہوگی۔

مجھے جو کچھ کہنا تھا میں عرض کر چکا۔ اب میں اس مختصر خطبہ کو ان چند اشعار پر ختم کرتا ہوں جو میں نے صدر محترمہ کی شان میں عرض کئے ہیں۔ میری زبان نے میرے دل کی ترجمانی میں بہت کوتاہی کی ہے لیکن وہ موقع بھی تو نہیں ہے کہ نظر حلِ مطلب کر سکے۔ اُمید ہے کہ صدر محترمہ میری کوتاہیوں سے درگزر فرمائیں گی۔

قطعہ

آمد ہے وطن میں گلِ رعنائے وطن کی　　کھلتی ہے کلی ہر دلِ شیدائے وطن کی
ہر لب پہ ہے تیرے ہی ترانوں کا ترنم　　تو روحِ رواں ہے، لبِ گویائے وطن کی
تیرے ہی خد و خال سے ملتی ہوئی کچھ ہے　　دل میں جو وہ تصویر ہے لیلائے وطن کی
تو ایک تجلی تو ہے، لیکن نہیں کھلتا　　ماضیِ وطن کی ہے، کہ فردائے وطن کی
مخمور نگاہوں سے تری قدر بڑھی اور　　اغیار کی محفل میں بھی صہبائے وطن کی
تھوڑی سی بچی ہے تری شیرینیِ لب میں　　سب لُٹ گئی دولت من و سلوائے وطن کی
بلبل کی زباں غنچۂ رنگیں کو عطا کی　　شوخی کوئی دیکھے چمن آرائے وطن کی

اب تو ہی دکھا راہ، نظر تیری طرف ہے
صحرا میں ہر اک بادیہ پیمائے وطن کی

"آنند نرائن مُلّا"

مسز سروجنی نائڈو صدر مشاعرہ کانگریس لکھنؤ سنہ ۱۹۳۶ء

کا

پیام

شاعری زندگی کی طرح اپنی وسعت میں لامحدود ہے اور اپنے مقصد میں پُر تنوع یہ وہ نادر آئینہ ہے جو حسن کے ہر طرز جلوہ کی آئینہ داری کرتا ہے یہ وہ زرّیں پیمانہ ہے جو کہ حقیقت کی ہر نقطۂ نظر سے پیمائش کرتا ہے یہ ہر انسانی جذبہ۔ سعی۔ مشاہدہ۔ ترک یا حصول کا ایک پُر کیف اور پایندہ نغمہ ہے یہ ہر رسم و قید سے انسانی آزادی کی ایک شاندار پیشین گوئی ہے اور دُنیا کے زخمی اور مضطرب دل کیلئے پیغام سکون اور وعدہ عافیت۔



مسز سروجنی نائیڈو
صدر آل انڈیا مشاعرہ ۱۹۳۶ع

اذن بیداری

بلبل ہند مسز سروجنی نائیڈو کی ایک معرکۃ الآرا انگریزی نظم کا ترجمہ

اے مادر وطن بیدار ہو! تیرے بچّے التجا کرتے ہیں۔

وہ بچّے جو تیرے سامنے تیری خدمت اور پرستش کے لئے دو زانو ہیں۔

رات ایک خوابِ زریں جلوؤں سے جگمگا رہی ہے۔

تو کیوں ابھی تک رنج و غم کی اسیری میں محوِ خواب ہے؟

اُٹھ! اور ان مصیبت کی کڑیوں کو جو ہمیں جکڑے ہوئے ہے توڑ ڈال! اور ہمارے ہاتھوں کو اُن کامیابیوں کے لئے جو اُن کو مسکرا کر بلا رہی ہیں۔ پاک بنا۔

اے مادرِ محبوبہ! کیا ہم تیرے وارث نہیں گے؟

کیا تیری ہمہ گیر طاقت اور تیرے غرور جوش و ہمّت کے ہم حقدار نہیں ہیں؟۔

ہم تجھ کو ہرگز بھولنے والے یا چھوڑنے والے نہیں۔ ان کے قدم تیری خدمت میں کیسے ہچکچائیں گے جن کے دل تیرے گھر ہیں۔ تیری سپر ہیں

اور تیری قربانگاہ ہیں۔

ہندو :۔ اے مادرِ وطن! ۔ ہم نے اپنی پرستش کے پھولوں کے ہار تجھ پر چڑھائے ہیں!

پارسی :۔ اے مادرِ وطن! ۔ ہم نے اپنی اُمید کے شعلوں میں تجھ کو گھیر لیا ہے۔

مسلمان :۔ اے مادرِ وطن! ۔ ہم نے اپنی محبت کی تلوار سے تیری حفاظت کی ہے۔

عیسائی :۔ اے مادرِ وطن! ہم نے اپنی عقیدے کے نغمے تیرے لئے گائے ہیں۔

سب متفقہ :۔ کیا تو ہمارے جذباتِ عقیدت سے متاثر نہ ہوگی۔ اے ملکہ! او دیوی! ہم تجھ کو پکارتے ہیں۔

خاکِ ہند

(از پنڈت برج نرائن چکبست مرحوم)

اے خاکِ ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیضِ قدرت تیرے لئے رواں ہے
تیری جبیں سے نورِ حسنِ ازل عیاں ہے
اللہ ری زیب و زینت کیا اوجِ عز و شاں ہے
ہر صبح ہے یہ خدمت خورشید پُر ضیا کی!
کرنوں سے گوندھتا ہے چوٹی ہمالیہ کی!

اس خاکِ دل نشیں سے چشمے ہوئے وہ جاری
چین و عرب میں جیسے ہوتی تھی آبیاری
سارے جہاں پہ جب تھا وحشت کا ابر طاری
چشم و چراغِ عالم تھی سرزمیں ہماری
شمعِ ادب نہ تھی جب یوناں کی انجمن میں
تاباں تھا مہرِ دانش اس وادیٔ کہن میں

گوتم نے آبرو دی اس معبدِ کہن کو
سرمد نے اس زمیں پر صدقے کیا وطن کو
اکبر نے جامِ الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے رانا نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

دیوار و در سے ابتک ان کا اثر عیاں ہے
اپنی رگوں میں ابتک ان کا لہو رواں ہے
ابتک اثر میں ڈوبی ناقوس کی فغاں ہے
فردوسِ گوش ابتک کیفیت اذاں ہے
کشمیر سے عیاں ہے جنت کا رنگ ابتک
شوکت سے بہ رہا ہے دریائے گنگ ابتک

اگلی سی تازگی ہے پھولوں میں اور پھلوں میں　　کرتے ہیں رقص اب تک طاؤس جنگلوں میں
اب تک وہی کڑک ہے بجلی کی بادلوں میں　　پستی سی آگئی ہے پر دل کے حوصلوں میں

گل شمع انجمن ہے گو انجمن وہی ہے
حب وطن نہیں ہے، خاک وطن وہی ہے

برسوں سے ہو رہا ہے برہم سماں ہمارا　　دنیا سے مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا
کچھ کم نہیں اجل سے خواب گراں ہمارا　　اک لاش بے کفن ہے ہندوستاں ہمارا

علم و کمال و ایماں برباد ہو رہے ہیں
عیش و طرب کے بندے غفلت میں سو رہے ہیں

اے صور حب قومی اس خواب سے جگا دے　　بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے　　اٹھتے ہوئے شرارے پھر آگ اسے دکھا دے

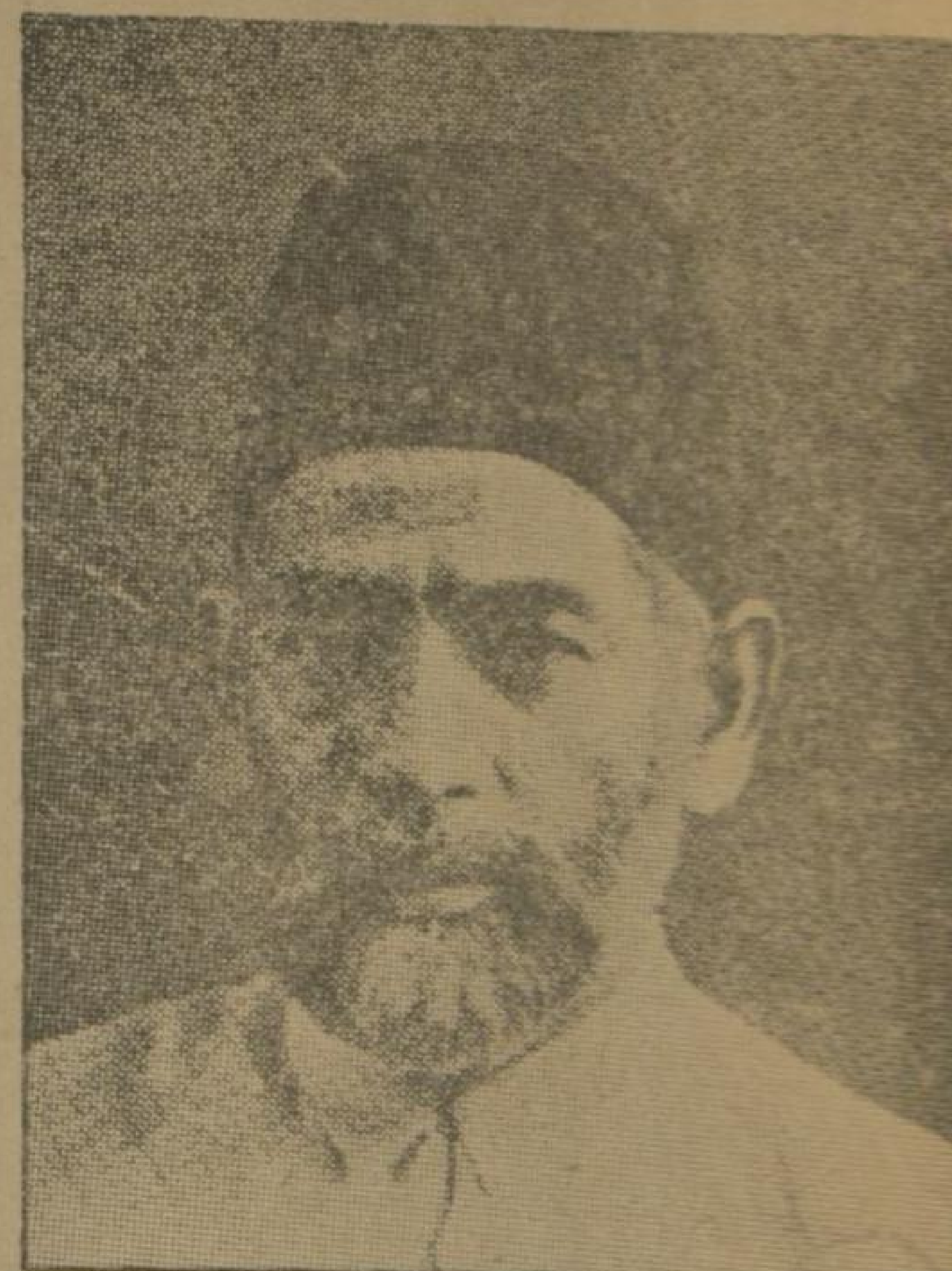
حب وطن سمائے آنکھوں میں نور ہو کر
سر میں خمار ہو کر دل میں سرور ہو کر

شیدائے بوستاں کو سرو و سمن مبارک　　رنگیں طبیعتوں کو رنگ سخن مبارک
بلبل کو گل مبارک گل کو چمن مبارک　　ہم بیکسوں کو اپنا پیارا وطن مبارک

غنچے ہمارے دل کے اس خاک میں کھلینگے
اس خاک سے اٹھے ہیں، اس خاک میں ملیں گے

ہے جوئے شیر ہمکو نور سحر وطن کا　　آنکھوں کی روشنی ہے جلوہ اس انجمن کا
ہے رشک مہر ذرہ اس منزل کہن کا　　تلتا ہے برگ گل سے کانٹا بھی اس چمن کا

گرد و غبار یاں کا خلعت ہے اپنے تن کو
مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو



وصل بلگرامی
رکن مجلس استقبالیہ



آنند نرائن ملا
صدر مجلس استقبالیہ



آشفتہ لکھنوی
رکن مجلس استقبالیہ



امین سلونوی
معتمد مجلس استقبالیہ



شوکت تھانوی
رکن مجلس استقبالیہ

پنچسالہ منصوبہ

کو

کامیاب بنانے کے لیے نشہ بندی تحریک کامیاب بنائیے

قوم کی صحت مندی اور خوشحالی کے لیے

سماج سے نشہ کی برائیوں کو دور کرنا

بہت ضروری ہے

کیوں کہ

نشہ بہت بری چیز ہے اسکے استعمال سے

تن کھو کھلا۔ عمر کم۔ جسم کمزور اور نگاہ میں کمی پیدا ہوتی ہے۔ —— اور

آپکی کمائی کا ایک بڑا حصہ برباد ہو جاتا ہے

اس لیے

اس دھن کو بچا کر اپنے بچوں کیلئے محفوظ کیجیے!

یہ اپیل ڈسٹرکٹ ٹمپرنس ایسوسی ایشن لکھنؤ کے سکریٹری
شری جگت بہادر سریواستوا ایڈوکیٹ نے
جاری کیا

نظمیات

قوم سے خطاب

(امین سلونوی، سکریٹری مشاعرہ)

سُن مری باتیں ذرا سُن اے ذلیل و خوار قوم
اے وطن دشمن ستم آزار، اے غدار قوم

بے نوا، بے رحم، اپنی جان سے بیزار قوم
بے حمیت، بدنصیب، اے مفلس و نادار قوم

اپنی حالت پر تجھے اب شرم کیوں آتی نہیں
کیا غریب آزاریاں بھی تجھ کو تڑپاتی نہیں

مٹ چکے ہیں عظمتِ دیرینہ کے نقش و نگار
تجھ سے چھینا جا چکا ہے تیرا سب عز و وقار

لٹ چکا ہے اس چمن کا ہائے سامانِ بہار
ہو رہا ہے اب گریبانِ وطن بھی تار تار

تو مگر ہے خواب میں تجھ کو نہیں کچھ بھی خیال
تیرے چہرے پر نہیں ہے آج بھی گردِ ملال

دولت و علم و عمل کیا چیز تیرے پاس ہے
تجھ پہ دنیا تنگ ہے تو مورد افلاس ہے

دیکھ اپنا رنگِ رُخ اب مائلِ صد یاس ہے
تجھ کو کچھ اپنی خبر ہے تجھ کو کچھ احساس ہے

اک طرف ہے فاقہ مستی اک طرف فخر و غرور
اشک و خوں سے ہو چکا لبریز قلبِ ناسور

جب نہیں پاتی ہے کھانے کو تو پیتی ہے لہو — مردم آزاری کی کرتی ہے تلاش و جستجو
بھائیوں سے اپنے ہی لڑتی ہے تو اے تند خو — تجھ میں اب انسانیت کی بھی نہیں باقی ہے بو
تو بہادر ہے مگر اپنے ہی گھر کے واسطے
تجھ میں ہمت ہے مگر دیوار و در کے واسطے

کیا ہوا اے قوم تجھ کو تیری غیرت کیا ہوئی — تیری ہمت کیا ہوئی، تیری شجاعت کیا ہوئی
تیری عزت کیا ہوئی، وہ تیری رفعت کیا ہوئی — تیری صنعت، تیری حرفت، تیری طاقت کیا ہوئی
سچ بتانا آج کیوں غمگین و افسردہ ہے تو
رخ ہیں کمھلائے ہوئے ہے اور پژمردہ ہے تو

بے حسی افلاس اور بغض و عداوت تجھ میں ہے — رنجش بیجا و کینہ اور نفرت تجھ میں ہے
غیر کی ہمدرد، اپنوں سے کدورت تجھ میں ہے — کیا بتائیں تجھ کو جو اے بے مروت تجھ میں ہے
تیرے جو اعمال ہیں وہ ہیں ریا کے واسطے
باخدا تجھ میں نہیں کوئی خدا کے واسطے

وہ مسرت اور وہ عشرت کا ترانہ یاد کر — جس کو تو بھولی ہوئی ہے وہ فسانہ یاد کر
وہ بہار بزم وہ دور شبانہ یاد کر — وہ تمدن اور وہ اپنا زمانہ یاد کر
ذرے ذرے کے جہاں پر داستاں مرقوم ہے
غیر سے کیا پوچھتی ہے تجھ کو خود معلوم ہے

مثل تجاروں کے نہ شوق مال و دولت چاہیے — مثل شاہوں کے نہ فکر جاہ و حشمت چاہیے
آسماں کی سی نہ تجھ کو حرص رفعت چاہیے — ہاں یہ سب بیکار ہیں تھوڑی سی ہمت چاہیے

اپنی ملّت، اپنا ملک، اپنا وطن آزاد کر
جس قدر بربادیاں ہیں اُٹھ اُنھیں برباد کر

دیر و مسجد چھوڑ شیخ و برہمن کے واسطے
غنچہ و گل وقف کر اہل چمن کے واسطے

شمع محفل کر فروزاں انجمن کے واسطے
تجھ کو جو کرنا ہے کر اپنے وطن کے واسطے

اس سے کچھ حاصل نہیں وہ صلح ہو یا جنگ ہو
تجھ کو اپنے رنگ سے مطلب ہے کوئی رنگ ہو

بس یہی ہے کفر تیرا اور یہی اسلام ہے
بس یہی آغاز تیرا اور یہی انجام ہے

بس یہی تحفہ ہے تیرا اور یہی انعام ہے
بس یہی اک مدعا ہے اور یہی پیغام ہے

گر رہا ہے تیرا گھر ہاتھوں پہ اس کو تھام لے
وقت عجلت کا ہے جلدی اُٹھ خدا کا نام لے

ترانۂ آزادی

از :- جناب عمر انصاری لکھنوی

بھارت کے اے سپوتو آؤ گلے لگائیں — اپنی تباہیوں کا افسانہ کہہ سنائیں
سب ایک ہو کے نغمے آزادیوں کے گائیں — پچھلی مصیبتوں کو اب دل سے بھول جائیں

بھارت کی پاک دیوی ملنے کو آ رہی ہے
آزادیوں کا جھنڈا ہمراہ لا رہی ہے

اک نور ہے جو سر سے پا تک برس رہا ہے — گویا مسرتوں کا چشمہ اُبل پڑا ہے
اندازِ والہانہ اقدام جانفزا ہے — ہر ذرۂ چمن اب بیدار ہو رہا ہے

مانندِ رنگ و بو ہیں ہم ہند کے چمن میں
کتنی ہی ملتیں ہوں سب ایک ہیں وطن میں

اب وقت آ گیا ہے اُٹھیں بہار بن کر — پھولوں کی انجمن کے نقش و نگار بن کر
تارِ ربابِ ہستی، موجِ شرار بن کر — جوشِ عمل کی ضو میں اِک تاجدار بن کر

گلزارِ حریت میں کچھ تازہ گل کھلا دیں
پیشانیِ وطن پر دھبا جو ہے مٹا دیں

چھوٹے ہوؤں کو اپنے سینے سے پھر لگالیں — روٹھے ہوؤں کو جیسے ممکن ہو پھر منالیں
سب اپنے اپنے دل سے بغض و تعب نکالیں — جو چیز کھو چکے ہیں، اپنی اسے بنالیں

جوہر کی مسکراہٹ منور ریزہ ہے شفق میں
موتی یہ چمک رہے ہیں خورشید کے طبق میں

پہلو میں آج کیا ہے جو دل مچل رہا ہے — ارمان مدتوں کا شاید نکل رہا ہے
تھا خوار جو نصیبہ وہ پھر سنبھل رہا ہے — سویا ہوا مقدر کروٹ بدل رہا ہے

بھارت کی پاک دیوی تشریف لا رہی ہے
ہم روئے جا رہے ہیں، وہ مسکرا رہی ہے

طالب ہے یہ عمل کی، ہے حریت کی خواہاں — اس کے سوائے اس کو کوئی نہیں ہے ارماں
فریاد کر رہی ہے با گیسوئے پریشاں — ہاں اے مرے سپوتو، ہے تم میں جوش ایماں

کیوں دیر کر رہے ہو جھنڈے کے نیچے آؤ
جو منہ سے کہہ رہے ہو وہ کر کے بھی دکھاؤ

ہنگام یہ نہیں ہے آپس کی دشمنی کا — سوچو تو کیا نتیجہ ہوگا کٹا چھنی کا
راہ طلب میں موقع ہے قدم زنی کا — یکساں رہے ارادہ محتاج اور غنی کا

گر پاؤں چومتے ہو تو بھینٹ بھی چڑھاؤ
سر میرے پاس اپنا ہاتھوں پہ رکھ کے آؤ

قطعہ

(از: جناب سید محمد مدنی صاحب نیر الہ آبادی)

پھر آج زباں پر ہے افسانۂ آزادی — پھر آج پلا ساقی پیمانۂ آزادی
ہاں بادہ پلا لیکن وہ بادہ جسے پی کر — ہر شخص نظر آئے مستانۂ آزادی

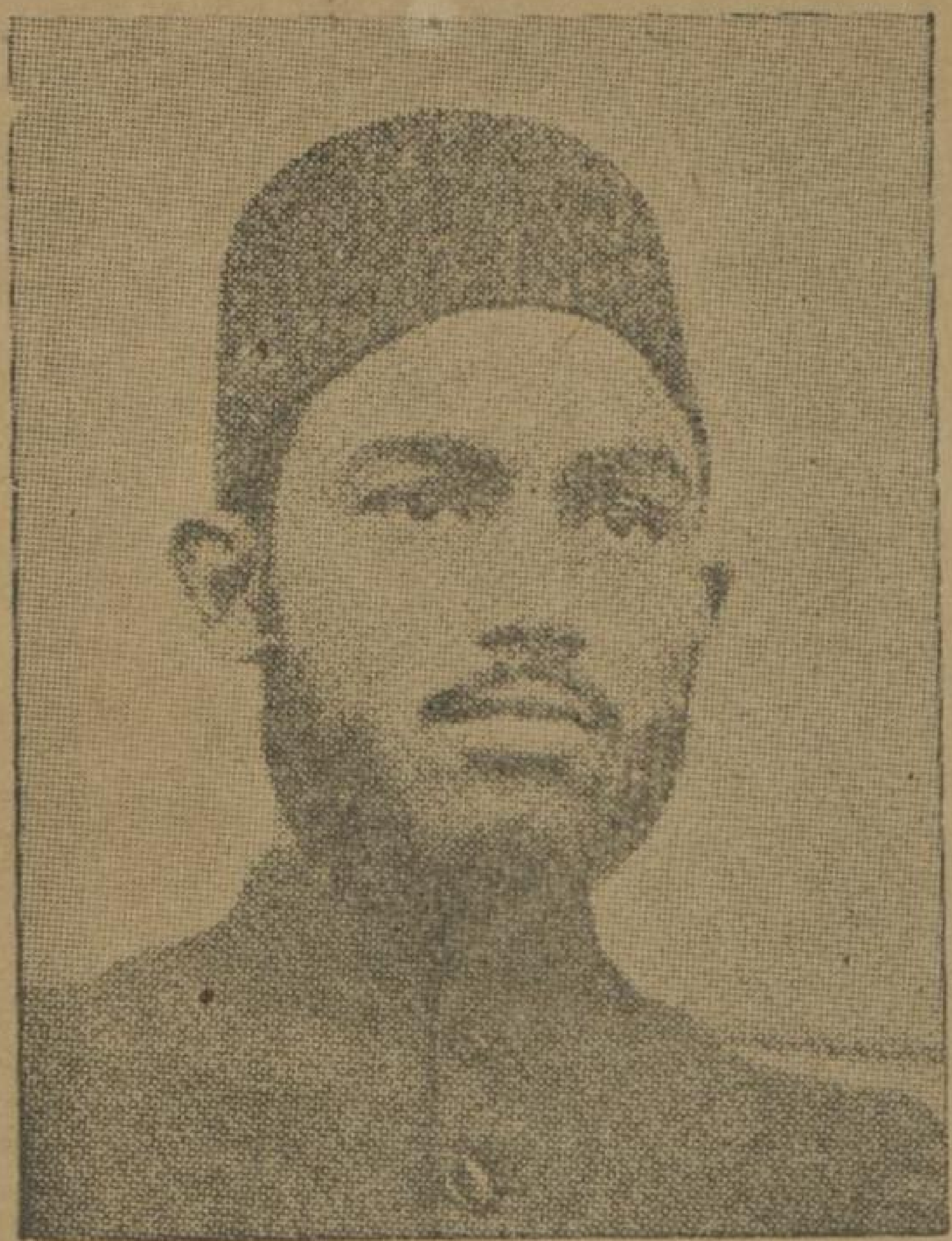
غُلامی

غلامی نے بہت صدمے دیے ہیں روحِ آدم کو — غلامی نے مٹا ڈالا بہت اقوامِ عالم کو
غلامی باعثِ بیداریِ ملت نہیں ہوتی — غلامی کی فضا سے آشنا فطرت نہیں ہوتی
غُلامی آشنا کرتی ہے انسانوں کو ذلت سے — غلامی کی جبیں کو ربط ہے پائے حقارت سے
غلامی کی صدا بے کیف و بے تاثیر ہوتی ہے — غلامی زندگی کے واسطے تحقیر ہوتی ہے
غلامی سر بسر محروم ہے احساسِ غیرت سے — غلامی کو کچل دیتی ہے دنیا سنگِ نخوت سے
غلامی سے تو یوں دنیا میں کوئی خوش نہیں ہوتا — معاذ اللہ! غلاموں سے خدا بھی خوش نہیں ہوتا
غلامی بے عمل قوموں کو پیغامِ مصیبت ہے — غلامی اہلِ غفلت کیلیے لعنت ہی لعنت ہے
غلامی ایک دردِ لا دوا ہے آہ کیا کہیے — غلامی اک وبا ہے، اک بلا ہے آہ کیا کہیے
غلامی کی فضا جلوہ گہِ امن ہو نہیں سکتی — غلامی کی شبِ تاریک روشن ہو نہیں سکتی
مرے پیارے وطن! بچنا غلامی کی فضاؤں سے — گزر جا مہرِ تابندہ کی صورت ان گھٹاؤں سے

ترے قربان، زنجیرِ غلامی توڑ دے پیارے
جو ہیں ٹوٹے ہوئے رشتے انھیں پھر جوڑ دے پیارے



دُرّ ہاشمی



نیر الہ آبادی



فیاض گوالیاری



عمر انصاری



کشتہ گیاوی

ہند کی صنفِ نازک سے

(از:- جناب محمد سعید الحسن صاحب دور ہاشمی کانپوری)

ہند کی اے صنفِ نازک عمر ہو تیری دراز — تیری ہستی ہے زمانے میں سراپا سوز و ساز
اے کہ تیرے سینے میں فطرت کی ہے پنہاں راز — خندہ زن ہے تیری ہستی پر زمانے کا فراز

آدمی کے واسطے قفلِ درِ رحمت ہے تو
ہیں ملک محروم جس نعمت سے وہ نعمت ہے تو

میں نے مانا مرد عزم و رزم کا مختار ہے — لیکن آخر اس حقیقت سے کسے انکار ہے
تجھ میں بھی اک جوش ہے اک جذبۂ ایثار ہے — تو زمانے میں برابر کی شریکِ کار ہے

کارنامے تیرے اب تک زینتِ تاریخ ہیں
تیرے تاریخی فسانے غیرتِ تاریخ ہیں

چاند بی بی، تارا بائی، رضیہ و نور جہاں — جن کے افسانوں سے ہے ہندوستاں "ہندوستاں"
جن کی عظمت جن کی ہمت سے ہے واقف کل جہاں — یہ تری بہنیں تھیں سب اے قیدیِ صحنِ مکاں

فکرِ راحت ہے تجھے پروائے عظمت کیوں نہیں؟
تجھ میں سیتا کی طرح وہ عزم و ہمت کیوں نہیں؟

تیرے چہرے پر نقابِ روئے فطرت چاہیئے — حسنِ صورت سے زیادہ حسنِ سیرت چاہیئے
غیرت و پاکیزگی و شانِ عصمت چاہیئے — تجھ کو پردے کی حقیقی معنویت چاہیئے

تیری غیرت، تیری عصمت جوش میں جب آئے گی
دیکھنے والی نظر واللہ خود جھک جائے گی

پردہ نامحرم سے ہر عورت کو کرنا چاہیئے — لیکن اپنے گھر میں گھٹ گھٹ کر نہ مرنا چاہیئے
شانہ و آئینہ سے کب تک سنورنا چاہیئے — زلف کو شانوں پہ اب تیرے بکھرنا چاہیئے

پل رہے ہیں قوم کے بچے تری آغوش میں
رازِ مستقبل ہے تیرے سینۂ خاموش میں

میں نے مانا، جانتی ہے شیوۂ تسلیم تو — میں نے مانا، ہے ہمارا حاصلِ تقسیم تو
میں نے مانا، ہے ازل سے واجب التعظیم تو — بھول بیٹھی ہے مگر "افسانۂ تعلیم" تو

جہل نے تیرے، ترے بچوں کو جاہل کر دیا
ان گلِ تازہ کو مرجھانے پہ مائل کر دیا

بچوں پر ہوتا ہے پہلے اپنی ماؤں کا اثر — وہ اگر ہوتی ہیں دریا یہ بھی بنتے ہیں گہر
مائیں جن بچوں کی ہیں علم و عمل سے بہرہ ور — گامزن ہوتے ہیں وہ بھی جادۂ تعلیم پر

یہ تو ہیں تازہ مسافر جست بھرتے جائیں گے
راستہ جو سامنے ہوگا گزرتے جائیں گے

یورپ و امریکہ میں بھی ہیں تری بہنیں مگر — جیسی تو ہے، وہ نہیں تیری طرح بے بال و پر
تو سراپا جہل ہو، وہ علم و عمل سے بہرہ ور — اُن کو آزادی میسر اور تو مجبور تر

یہ نہیں مقصد کہ اُن کو رہبر کامل بنا
اُن کے ہر اچھے عمل کو جادۂ منزل بنا

اُٹھ خدا کے واسطے بیدار ہو اے محو خواب — تو ہی بن سکتی ہے بدبختی کا ہم سب کی جواب
ہم سے ناکاموں کو کر سکتی ہے تو ہی کامیاب — تو نے جب چاہا کیا دنیا میں پیدا انقلاب

تو ازل ہی سے کلید قفل باب قوم ہے
تیری اک ہلکی سی جنبش انقلاب قوم ہے

چونک خواب جہل سے اُٹھ آشنائے علم بن — اپنے بچوں کیلیے خود رہنمائے علم بن
ابتدا کیا چیز ہے، تو انتہائے علم بن — لطف تو جب ہے کہ سر تا پا ادائے علم بن

علم کی جس روز تیرے انتہا ہو جائے گی
ہند کی دنیا غلامی سے رہا ہو جائے گی

انوکھا دیس

(از: جناب ضیاء الدین احمد صاحب ضیا آفتی گوالیاری بی۔ اے سکریٹری ناظم جماعت اصلاحی و رکن بزم اردو لشکر گوالیار)

اک ایسا دیس بھی ہے اس جہاں میں اے جہاں والو
جہاں انسان سے انساں کو انسیت نہیں دل میں

جہاں ہوتا ہے خون انسانیت کا نام مذہب پر
بچھائے جاتے ہیں پھولوں کے بستر کوئے قاتل میں

جہاں بچوں کو چیریں، عورتوں کی چھاتیاں کاٹیں
جہاں بوڑھوں کی گردن مار کر خوش ہوں بہت دل میں

جہاں باجے بجا کر شنکھ کی دھن میں خلل ڈالیں
جہاں قربان ہو گائیں برہمن کے مقابل میں

جہاں گھر کو جلا دیں گھر میں بیکس کو پناہ دے کر
جہاں مظلوم کی چیخوں پہ بہرے بھی ہنسیں دل میں

جہاں برسائے جائیں اینٹ پتھر راہ چلتوں پر
نہتے لوگ گھر جائیں جہاں انبوہ قاتل میں

جہاں کتے کی موت انسان مارے جائیں گلیوں میں
جہاں چھرا اتاریں بے خبر ہمسایہ کے دل میں

جہاں بیٹھے بٹھائے ایک طوفان ستم اٹھے
ہوا دیوانگی کی چل پڑے ہشیار و غافل میں

جہاں دم بھر میں آپس داریاں مٹ جائیں صدیوں کی
ادھر آنکھوں میں میل آئے، غبار آئے ادھر دل میں

جہاں اک مذہبی ہیرو بنا لیں ہر فسادی کو
جہاں ہو لیڈری کی شان ہر مفسد میں جاہل میں

قدم رکھتے جہاں شرمائے انسانی رواداری
لہو کے آنسوؤں روئے جہاں انسانیت دل میں

جہاں ہر ناسمجھ کی رائے سے مرعوب ہوں لیڈر
جہاں حق بات کی جرأت نہ ہو انسان کے دل میں

وطن کرتا ہو قرباں پیٹ پر ایک۔ ایک شہرت پر
جو ہے کچھ فرق، تو یوں فرق ہو نادان و عاقل میں

جہاں بڑے کو دیکھیں دو بٹا کھوئے ہوئے آنکھیں
جہاں منہ سے کہیں سب کچھ، مگر کچھ بھی نہ ہو دل میں

جہاں خلقت کے اَن داتاؤں کا چوسیں لہو جونکیں
جہاں عزت کی قربانی بھی ہو تحصیلِ محاصل میں

جہاں سَو میں سے اک، دولت زمیں میں گاڑ کر رکھے
جہاں ننانوے کی زندگی کٹتی ہو مشکل میں

جہاں چھوتے ہوئے ڈرتا ہو ایک انسان کو انساں
جہاں نیچ اونچ کے پھندوں سے ہو کُل قوم مشکل میں

جہاں ملنے نہ دیتی ہو دلوں کو نفرتِ باہم
ہوائی تیر سے چبھتیں ہری ہوتی ہوں ہر دل میں

گڑے مُردے اُکھڑتے ہوں جہاں جھوٹے فسانوں سے
بھڑک اُٹھتی ہوں رہ رہ کر جہاں چنگاریاں دل میں

جہاں ہٹ دھرمیاں باندھے ہوئے ہوں مورچہ اپنا
جہاں حُبِ وطن جکڑی پڑی ہو قلعۂ دل میں

جہاں پیٹوں پہ پتھر باندھ لیں، سیٹھوں کے بل نکلیں
مگر آپس میں سلجھانے کی گنجائش نہ ہو دل میں

سنا ہے تھا کبھی اس دیس میں ایسا بھی جگ کوئی
وہاں والے گنے جاتے تھے جب مردانِ عاقل میں

سنا ہے شرم بھی تھی ان میں غیرت بھی سمجھ بھی تھی
سنا ہے قابلیت تھی وہاں ہر فرد قابل میں

سنا ہے ان میں تھا ایثار بھی، خلق و مروت بھی
سنا ہے وہ جگہ کرتے تھے ہر انسان کے دل میں

سنا ہے بدھ انھی بے رحم قوموں میں ہوا پیدا
سنا ہے رام آئے تھے اسی ویران منزل میں

سنا ہے کرشن کا نغمہ انھی خطّوں میں گونجا تھا
سنا ہے پریم کی بنسی بجی تھی ان منازل میں

سنا ہے جب بھلے دن تھے تو مٹّی لعل اُگلتی تھی
سنا ہے خلق موتی رولتی تھی ان کے ساحل میں

انوکھی بات ہے یہ کچھ سمجھ میں تو نہیں آتی
سنا ہے وہ جہاں میں یوں تھے جیسے شمع محفل میں

انہیں سے ہر جگہ تہذیب پھیلی روشنی پھیلی
وہی جو شکلِ انساں اب ہیں اور حیوان ہیں دل میں

تمیز انکی بھلائی اور برائی کی نہیں مطلق
نہیں معلوم ہیں بھولے ہوئے کس وہمِ باطل میں

پرستش علم کی دیوی کی شاید اب نہیں ہوتی
برائی کے مٹانے والے، کی عزت نہیں دل میں

وہ بھُو کا دیس جس کو پھوٹ نے برباد کر ڈالا
انوکھا دیس تھا فیاض اس دنیا کی منزل میں

تعجب کیا بہار آ جائے اس اُجڑے نگر میں پھر
مری فریاد کا نشتر ان کے چبھ جائے اگر دل میں

دعوتِ عمل

(از:- جناب سید خلیل احمد صاحب تبسم، خلف حضرت وسیم خیرآبادی مرحوم)

ہاں! آؤ زندگی میں ہم کوئی کام کرلیں
لبریز یا بھر اپنی ہستی کا جام کرلیں

تارے گنیں یہ کیا ہے دن ہی ابھی پڑا ہے
کیوں صبح ہجر ہی کو مانند شام کرلیں

اُس وقت ہوگا حاصل کچھ لطف خیرگی کا
تیغ عمل کو ہم بھی جب بے نیام کرلیں

اپنی ہی ذات تک ہو کیوں سعیِ خیر جوئی
اس درد کو شریک بہبود عام کرلیں

ساقی تو چاہتا ہے محروم بادہ رکھنا
ہم خود ہی کیوں نہ آخر لبریز جام کرلیں

ساغر اگر پڑے ہیں ٹوٹے ہوئے تو کیا غم
چلو کو اپنے ساغر ہم تشنہ کام کرلیں

تقسیم مے ہو لیکن شایانِ شانِ رنداں
ہم بیخودی سے پہلے یہ اہتمام کرلیں

رکھتا بجائے خود ہے ہر رند منزلت کچھ
لازم ہے ہم لحاظِ ہر ننگ و نام کرلیں

ہم دعوتِ نظارہ عالم کو کیوں نہ دیدیں
کیوں شاہدِ عمل کو خلوت مقام کرلیں

مانا! کہ دانا دانا رکھتا ہے دلفریبی
ہم کیوں نہ امتیازِ صیاد و دام کرلیں

کہہ لے، اگر زمانہ کہتا ہے خام اس کو
ہم بھی تو امتحانِ سودائے خام کرلیں

وہ ہوک، جو دلوں میں رہ رہ کے اُٹھ رہی ہے
اس کو نہ کیوں بہ شکلِ لطفِ دوام کرلیں

یہ بھی کبھی نہ چھوٹے رشتہ نہ اُس کا ٹوٹے
یوں صیدِ آشتی کو ہم زیرِ دام کرلیں

کچھ دست و پا کو بخشیں لطفِ عمل نوازی
کانوں کو، ہم جو وقفِ لطفِ کلام کرلیں

آنکھیں ہیں پاس دیکھیں کچھ اور بھی ادائیں
کیوں خود کو صرف محوِ طرزِ خرام کرلیں

آخر خبر نہ بودن از انقلاب تاکے
اے صاحبانِ غفلت این وقتِ خواب تاکے

دیکھو! عمل کی دیوی وہ مسکرا رہی ہے
بجلی گرا رہی ہے غیرت دلا رہی ہے

بکھرے ہوئے نہیں ہیں ہوئے دراز اس کے
افسانہ ہائے ماضی تم کو سُنا رہی ہے

زنہار! اگر تبسم پر اس کے خوش نہ ہونا
اِک شمع بزم سمجھو جو جھلملا رہی ہے

کب پھول جھڑ رہے ہیں اس کی ہنسی سے پیہم
تم سب کی غفلتوں پر آنسو بہا رہی ہے

کب ہے لچک کمر میں افراطِ ناز کی سے
یہ ضعف کے سبب سے یوں لڑکھڑا رہی ہے

بہتاتِ تازگی سے چہرہ نہیں دمکتا
یہ وقتِ واپسیں کا منظر دکھا رہی ہے

ہرگز نہ تم سمجھنا رقص سُرور اس کو
یہ فرطِ درد و غم سے یوں تلملا رہی ہے

ہے چاک دامن اس کا ہرگز یہ شک نہ کرنا
حالات سب تمہارے نقشہ دکھا رہی ہے

دامن میں اس کے ہرگز گرہیں نہیں پڑی ہیں
تم کو تمہاری بھولی باتیں بتا رہی ہے

اپنے لئے نہیں ہے ذوقِ ترنم اس کا
غفلت کی نیند سے یہ تم کو جگا رہی ہے

منظور ہے تمہاری تنبیہ۔ کد نہیں کچھ
غیروں کی سمت سے جو فتنے اٹھا رہی ہے

ہے بر بنائے غیرت یہ اس کی دُور باشی
اس سے نہ تم سمجھنا دامن بچا رہی ہے

احساس جب تمھیں کو پیدا نہ ہو تو کیا ہو
آغوشِ اُلفت اس کی ہر وقت وا رہی ہے

ہو جوش تو اُٹھو تم، ہو شوق تو بڑھو تم
دیکھو تمہاری جانب وہ خود اب آ رہی ہے

لپکو! گلے لگا لو، آغوش میں اُٹھا لو
اب تک تو بیکسی میں یہ مبتلا رہی ہے

ہے جو ادا وہی ہے دِل موہ لینے والی
ہے جو نظر پیامِ اقدام لا رہی ہے

دل میرود ز دستم صاحب دلاں خدا را
دردا کہ رازِ پنہاں خواہد شد آشکارا

حُبِّ وطن

از جناب منظر صدیقی اکبرآبادی "مدیر کنول" آگرہ

اے مرے دلربا وطن، مشرقِ پُرضیا وطن — نورِ وطن، صفا وطن، ماہ وطن، سہا وطن
ہیں تری ہر ادا سے ہوں صد گل و لالہ در نظر — تو ہے مری نگاہ میں جنتِ جاں فزا وطن
ہیں ترے سبزہ زار پر چھائی ہوئی لطافتیں — سرد تری ہوا وطن، مست تری گھٹا وطن
روح میں اک سرور ہے، ذہن میں اک غرور ہے — دلمیں ہے موجزن تری، نور بھری فضا وطن
رفعتِ کوہسار سے تیری بلندیاں عیاں — نغمۂ آبشار میں تو ہے نوا سرا وطن
چاندنی تیری شمعِ بزم، اور بہار گل فروش — عطر میں اور کیف میں تو ہے بسا ہوا وطن
اپنے حریمِ پاک سے میری عقیدتیں نہ پوچھ — قابلِ سجدہ ہیں مجھے، حُسن، خدا، وفا وطن

تو ہے مآلِ زندگی نشو و نما بھی تجھ سے ہے
میری بقا بھی تجھ سے ہے اور فنا بھی تجھ سے ہے

حُبِّ وطن جو حاصلِ عشرتِ روزگار ہے — میرا اصولِ زندگی، میرا نظام کار ہے
حُبِّ وطن سے روح کا کیف بڑھا رہا ہوں میں — دل میں ہے ایک نشہ سا، آنکھ بھی پُرخمار ہے
حُبِّ وطن ہے نغمہ گر چنگ میں اور جنگ میں — زینتِ لالہ زار ہے، مصیبتِ کارزار ہے
حُبِّ وطن کی آگ سے دل میں گرمیٔ حیات — نغمہ بھی سوز آفریں، ساز بھی شعلہ بار ہے
حُبِّ وطن کے جوش میں مستِ مئے خیال ہوں — طوق گلے میں ہو تو ہو، دلپہ تو اختیار ہے
حُبِّ وطن سے ہے قفس حاملِ عیشِ آشیاں — ایک خیالِ حریت حاصلِ صد بہار ہے
حُبِّ وطن سے کام لے، حبِّ وطن کر اختیار — ہے وہی عظمتِ وطن، جسکو وطن سے پیار ہے

ہے یہی ایک شاہراہ زندگیٔ دوام کی
مُہرِ وطن پہ ثبت کر خون سے اپنے نام کی

ہندی نوجوان سے خطاب

از:- جناب عرشی صدر انجمن ارباب ادب لکھنؤ

پابندِ جنوں رہ کر دل کو ہر قید سے بیگانہ کر دے — ہر ذرے کو صحرا کر دے ہر قطرے کو دریا کر دے
پھر نغمۂ شیخ و برہمن کو اک ساز میں توام پیدا کر دے — پھر کعبہ کو بتخانہ بنا بتخانے کو کعبا کر دے
مرجھائے ہوئے پھولوں میں پھر بھر دے تو ایسا رنگ کوئی — فردوسِ نظر دنیا کے لئے جو ہند کا نظارا کر دے
آنکھوں سے غائب کر دے پھر تصویر بتانِ مغرب کو — لیلائے وطن کے جلووں کا ہر دل کو آئینا کر دے
پھر پھونک دے کوئی روحِ عمل تو خاک کے بے حس پتلوں میں — پھر ہر تصویرِ بیجاں کو زندہ کر دے گویا کر دے
پھر ایسا ہوش ربا نغمہ پیدا کر سازِ شکستہ سے — جو ہر گل کو بلبل کر دے ہر شمع کو پروانا کر دے
پھر قوم کو تو شمشیروں کے سائے میں جینا سکھلا دے — پھر مرگ و زیست کے خطروں سے ہر دل کو بے پروا کر دے
پھر خارِ وطن میں پیدا کر گلہائے چمن کی رنگینی — پھر خاک کے ذرے ذرے کو آنکھوں کیلئے تارا کر دے
ہندو کو مسلم دل سمجھے، مسلم کو ہندو جاں سمجھے — لبریز مے الفت سے یوں ہر دل کا پیمانا کر دے
جینے کی تمنا گر ہے تجھے مرنے کا ذوق بھی پیدا کر — مطلوب اگر ہے تجھ کو بقا تو خود کو نذرِ فنا کر دے
ظالم بھی نہ جس کو دیکھ سکے وہ تصویرِ مظلومی بن — بے جنگ و جدل پھر نالوں سے دنیا کو تہ و بالا کر دے

پھر اپنے شعلۂ باطن سے تو ہند کو بزمِ نور بنا
پھر خاک کے ذرے ذرے کو چمکا کر رشکِ طور بنا

بیگانۂ حال زبوں کیلئے آئینۂ مستقبل ہو جا — ہر گم کردہ منزل کیلئے تو ہی خضرِ منزل ہو جا
اک حشر بپا کرنے کیلئے آوازِ شکستِ دل ہو جا — قاتل بھی جو دیکھے ہو بسمل وہ رقصِ دلِ بسمل ہو جا

یا سوزِ دلِ پروانہ یا شمعِ سرِ محفل ہو جا
یعنی دنیائے محبت میں رہنے کے تو قابل ہو جا

ہر قلب کی تو تجلی ہو جا ہر روح کی تو مستی بن جا
ہر درد کا تو درماں بنجا ہر ارماں کا حاصل ہو جا

بن جا تو کبھی تصویرِ جنوں کھلا تو کبھی ضبطِ عاقل
یعنی ہو روانی میں دریا رک جانے میں ساحل ہو جا

رہبر کی ضرورت کیا تجھ کو۔ رہوار کی حاجت کیا تجھکو
خود ہی جادہ، خود ہی رہرو، خود ہی خضرِ منزل ہو جا

گر دین کا سالک ہو نہ سکا، دنیا ہی کا مالک بن جا
یا مرنے کا حاصل ہو جا یا جینے کا حاصل ہو جا

پھر اپنے جلوۂ باطن سے بن کعبۂ چشم تماشائی
پھر حسنِ رخِ لیلیٰ کے لئے تو سرتا پا محمل ہو جا

ایثار و خلق و محبت کا پتلا بن کر پھر دنیا میں
بسمل کے لئے ہو وجہ سکوں بیدل کیلئے تو دل ہو جا

معیارِ صداقت بن کر پھر تو جلوہ نما ہو دنیا میں
پھر بندۂ حرص و ہوا کیلئے تمیزِ حق و باطل ہو جا

پھر پیکرِ جوشِ جنوں بنکر ہو جا دنیا کی روحِ رواں
پھر ہو کے شہیدِ حبِ وطن زندوں میں تو شامل ہو جا

پھر اپنے ماضئ زریں کو واپس لے آ مستقبل میں
پھر آزادی کی لیلیٰ کو بٹھلا دے لاکر محفل میں

زنجیرِ غلامی

(از جنابہ زاہدہ خلیق الزماں صاحبہ زاہدہ لکھنوی)

کہاں تک اے ستمگر چرخ تدبیریں غلامی کی — کہ اب بار گراں ہیں دل کو زنجیریں غلامی کی
سبق دیتی ہیں آزادی کا تاثیریں غلامی کی — زبانِ حال سے کہتی ہیں تصویریں غلامی کی

ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لیں گے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لیں گے

رہے گی ایک قوم غیر کب تک حکمراں ہم پر — کہاں تک ہوں گی گوناگوں ستم آرائیاں ہم پر
رہیں خوش قید میں ہم اور ہنسے سارا جہاں ہم پر — سنا! اب آپ خوش ہوں یا خفا ہوں مہرباں ہم پر

ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لیں گے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لیں گے

بہت دن تک اٹھائے ناز بیجا آپ کے ہم نے — کلیجہ تو یہ چھلنی کر دیا ہے خنجر غم نے
ہوئی بیدار دنیا کروٹیں بدلی ہیں عالم نے — اٹھایا ہے یہ بیڑا اب ہماری قوم بیدم نے

ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لیں گے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لیں گے

بہت دن تک اٹھا کے فائدے ہم پر حکومت کی — مٹا ڈالا ہمیں، اور اپنے قبضے میں تجارت کی
دئیے دھوکے، اڑائیں دھجیاں دامانِ صنعت کی — حفاظت خود کریں گے اب ہم اپنی ملک و ملت کی

ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لیں گے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لیں گے

بہت دن تک لڑایا تم نے ہم کو اپنی فطرت سے
نہ دھوکا کھائیں گے اب بھول کر فرضی محبت سے
ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لینگے

ستمگاری کہاں تک اب نہ مضطر دل کو تڑپاؤ
نہیں کچھ مانگتے تم سے ہمارا حق ہمیں دیدو
ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لینگے

ہمارا ملک ہے اس کی حکومت حق ہمارا ہے
کہ آزادی کی خاطر ہم کو ہر ایذا گوارا ہے
ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لینگے

مٹا جاتا ہے نام ہند اے آشفتہ سامانو
اٹھو اور متحد ہو جاؤ اے ہندو مسلمانو
ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لینگے

یہ سب آزاد ہیں اب رنگ آزادی دکھائینگے
مریں گے جان دینگے غم سہیں گے جیل جائینگے

ہو کیوں مانع ہمیں پابند رکھ کر اوج رفعت سے
یہ صاف الفاظ میں ہندی کہیں گے اب حکومت سے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لینگے

جو ہے انصاف کا دعویٰ تو کچھ انصاف دکھلاؤ
نہیں تو پھر یہ ہونا ہے بہت اچھی طرح سن لو
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لینگے

بتاؤ تو یہاں پر کون سا حصہ تمہارا ہے
خدا کے فضل سے رفعت پہ قسمت کا ستارا ہے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لینگے

کہاں تک سختیاں جھیلو گے آخر اے گراں جانو
لگاؤ نعرہ آزادی کا یوں ہندوستاں والو
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لینگے

کہ اب ہندوستاں والے فریبوں میں نہ آئینگے
مگر اے زاہدہ اب جشن آزادی منائینگے

ہم اپنا ملک، اپنا تخت، اپنا تاج لے لیں گے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لیں گے



بیگم زاهدہ خلیق لکھنوی

انتباہ

از جناب سخاوت حسین صاحب سخاؔ شاہجہانپوری

اہلِ عالم کی زباں بھی اور ترا افسانہ تھا — تو ہی دنیا میں حریفِ ہمّتِ مردانہ تھا
بات کل کی ہے کہ قبضہ میں ترے پیمانہ تھا — سب تو میکش تھے مگر تو صاحبِ میخانہ تھا

اب یہ وقت آیا کہ رسمِ دَورِ مے باقی نہیں
میکدہ تو ہے وہی لیکن کوئی ساقی نہیں

فطرت آزاد تیرا لے رہی ہے امتحاں — تو مگر غافل ہے او ناواقفِ سود و زیاں
زندگی چاہے تو بن جا زندگی کا رازداں — ورنہ تجھکو پیس ڈالیں گے زمین و آسماں

نیند سے بیدار ہو یہ وقت سونے کا نہیں
زیست وہ سرمایہ ہے جو جمع ہونے کا نہیں

کام ہیں تیرے ادھورے کوششیں ہیں ناتمام — وائے نادانی کہ تو ہے اور مئے غفلت کا جام
مقصدِ تخلیق کا واجب ہے تجھ پر احترام — گوشِ دل سے سُن کہ فطرت دے رہی ہے کیا پیام

اے ضمیرِ لفظِ کُن اے رازدارِ زندگی
چند روزہ ہے زمانے میں بہارِ زندگی

قصرِ استعداد کے کیا دیکھتا ہے بام و در — اپنی دنیا خود بنا، ہے ذوقِ آزادی اگر
شمع کے آنسو نہیں خود اپنے ہی انجام پر — خاک پروانہ اگر ہو صرفِ تعمیرِ سحر

کام لینا چاہیئے تجھ قوتِ تسخیر سے
فائدہ کیا شکوۂ ناکامیٔ تقدیر سے

زندہ ہے لیکن متاعِ زیست سے محروم ہے — تو نہیں واقف کہ آزادی کا کیا مفہوم ہے

بے خبر اپنی حقیقت بھی تجھے معلوم ہے
نوعِ انساں ہے مگر انساں کا محکوم ہے
اپنا رہبر بن تلاشِ رہبرِ منزل نہ کر
کام لے ہمّت سے فکرِ عقدۂ مشکل نہ کر

منزلِ جمہوریت اک راہِ ناہموار ہے
مجلسِ اصلاح و آئینِ قیصری دربار ہے
قوتِ سرمایہ داری بر سرِ پیکار ہے
جو کیا کرتا ہے محنت وہ ذلیل و خوار ہے
اہلِ ثروت کی نگاہ خشمگیں مشہور ہے
بات یہ ہے وہ ہیں مالک اور تو مزدور ہے

بے حسی کی نیند سے ہشیار ہو او محوِ خواب
تیری اک کروٹ میں مضمر ہیں ہزاروں انقلاب
یہ جمودِ مستقل بن جائے وجہِ اضطراب
ذرّے یوں چمکیں کہ ہوں خورشیدِ خاور کا جواب
جامِ صہبا دے رہا ہے ساقیِ فطرت تجھے!
اب دکھائے گی عروسِ آرزو صورت تجھے!

کامیابی کی نظر میں منظرِ بیداد کیا
حرّیت کی راہ میں اندیشۂ افتاد کیا
فکرِ گلچیں کیا، خیالِ نکہتِ برباد کیا
ہوش میں آ شکوۂ بیرحمیِ صیاد کیا
اجتماعی قوتوں سے اک جہانِ نو بنا
جمع کر اوراقِ گل اور گلستانِ نو بنا

قوم کے افراد یعنی خشتِ دیوانِ وطن
متحد ہو کر بڑھائیں سطوت و شانِ وطن
سر میں سودا، دل میں ہو تنویرِ عرفانِ وطن
جمع اک مرکز پہ ہو جائیں نگہبانِ وطن
پھر جنوں افزا بہار آنے کا کچھ ساماں ہو
اس چمن کی ہر روش کا اک نیا عنوان ہو

انقلاب زندہ باد

از جناب پنڈت انند نرائن ملا صاحب بی۔اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ لکھنؤ

شوق ہوا بے حجاب   ختم ہوا دورِ خواب
آگیا روزِ حساب   قوم کا چمکا شباب
زندہ باد انقلاب

انقلاب زندہ باد

سُرخیِ عنوانِ ما   جذبۂ پنہانِ ما
ہم دل و ہم جانِ ما   گوہرِ دامانِ ما
آیت ایمانِ ما

انقلاب زندہ باد

فتنۂ و شر، تابہ کے   دورِ قمر، تا بہ کے
طاعتِ زر، تا بہ کے   خونِ ہنر، تا بہ کے
زیر و زبر تا بہ کے

انقلاب زندہ باد

کب تک اسیرِ محن   کوہ کن خستہ تن
خسروِ پر مکر و فن   خندہ زن و گامزن
طرحِ جہان برفگن

انقلاب زندہ باد

جہل و کدورت مٹا　　شانِ درت مٹا
جوشِ خصومت مٹا　　زعمِ حکومت مٹا
رنج صعوبت مٹا
انقلاب زندہ باد

توڑ پرانا نظام　　دائرہ خاص و عام
بندشِ قوم و مقام　　دے یہ جہان کو پیام
لے کے اخوت کا نام
انقلاب زندہ باد

دُور ہو سب ایک بار　　تفرقۂ روزگار
مفلس و سرمایہ دار　　بندہ و با اختیار
کشمکشِ گیرودار
انقلاب زندہ باد

پھر سے لگا اِک چمن　　سرو و گل و یاسمن
قمری شیریں دہن　　جب ہو وہاں نغمہ زن
گونجے فضائے وطن



ذوقی گونڈوی



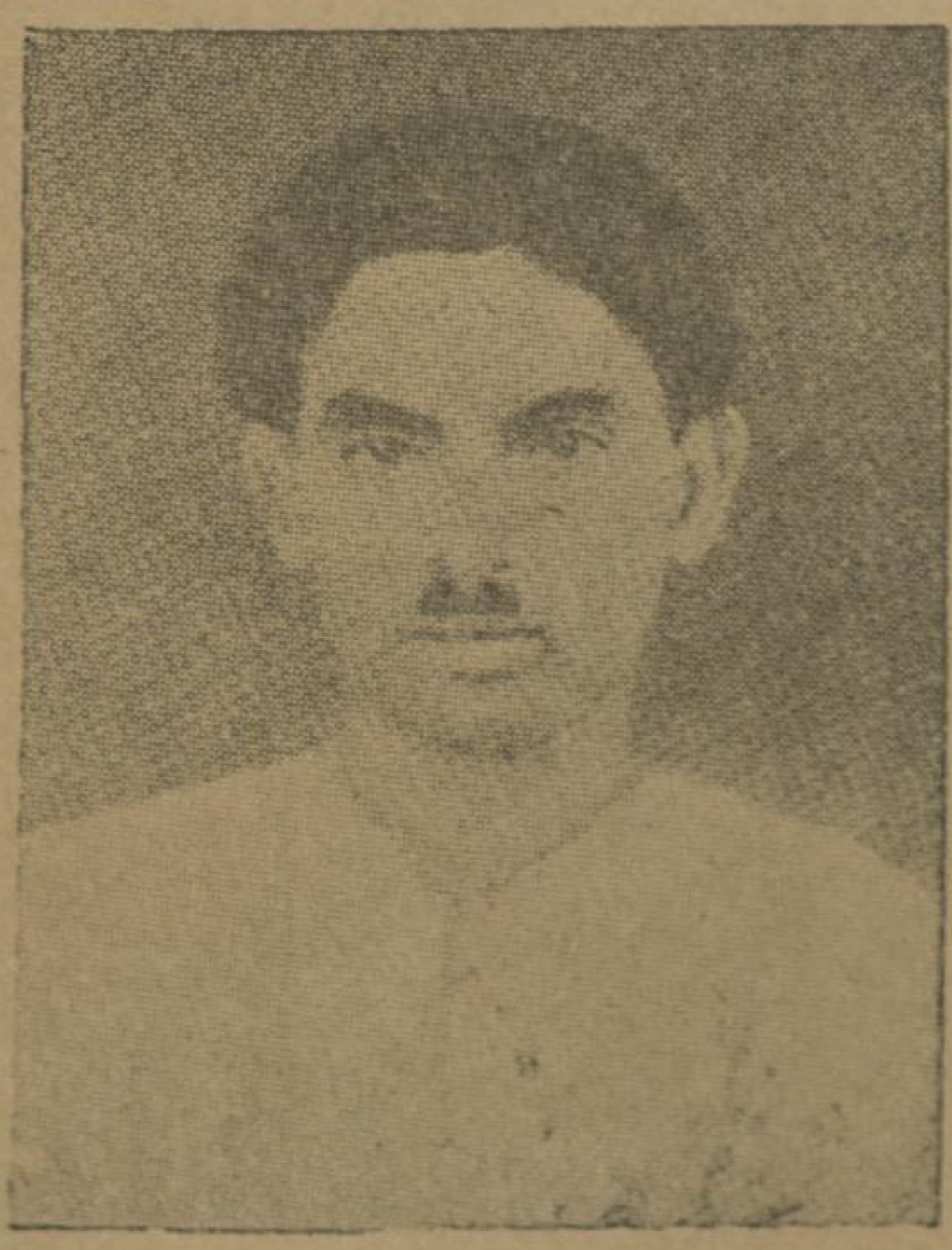
سخا شاہجہاں پوری



بسمل الہ آبادی



عرشی لکھنوی



روش صدیقی

انقلاب زندہ باد

صبح ہو جب آشکار از طرفِ کوہسار
یہ خبرِ خوش گوار گُل کو سُنا، اے ہزار
وعدۂ فصلِ بہار
انقلاب زندہ باد

سہل کُن مشکلات قوم کی راہ نجات
دہر کا رازِ حیات فلسفۂ کائنات
لالۂ سخن، ایک بات
انقلاب زندہ باد

نعرۂ مستانہ!

از جناب بسملؔ الہ آبادی

(۱)

گرفتارِ بلا بیتاب محزوں خستہ تن ہم ہیں
مگر اس پر بھی وجہ زینتِ رنگ چمن ہم ہیں

ستم گر فتنہ جو عیارِ ظالم سے کوئی کہہ دے
کہ سودا ہے وطن کا سر میں شیدائے وطن ہم ہیں

لباسِ حُبِّ ملکی رنج کے رنگ اپنا دکھائے گا
بنیں گے جس سے بھائے زخم کے وہ پیرہن ہم ہیں

ہماری روشنی سے روشنی عالم میں پھیلی تھی
اندھیرا دور جس سے ہوگیا ایسی کرن ہم ہیں

ملے گی چادر خاک وطن بے جان ہونے پر
کفن والے نہ یہ سمجھیں کہ محتاج کفن ہم ہیں

ہمارے واسطے زنداں نہیں ہے بزم جنت ہے
فروغ انجمن زینت دہِ صدر انجمن ہم ہیں

فدا کر دیں گے لیلائے وفا پر جان شیریں تک
کمالاتِ جنوں میں قیس ہم ہیں کوہ کن ہم ہیں

ہمیں تنظیم سے ہے کام مندر ہو کہ مسجد ہو
حرم میں شیخ ہم ہیں، بتکدے میں برہمن ہم ہیں

ارادہ ہے بڑھا کر ارتباط ہندو و مسلم
دکھا دیں دشمنوں کو صورت گنگ و جمن ہم ہیں

ادھر ہے آندھیوں کا زور، ادھر سیلاب دریا کا
حفاظت چاہئے ہر دم، کہ بنیادِ کہن ہم ہیں

گرفتار مصائب ہو کے غم ہو کیا مصائب کا
زمانہ جانتا ہے خوگرِ دار و رسن ہم ہیں

نہ وہ اگلا ترانہ ہے نہ وہ اگلا فسانہ ہے!
زمانے میں ہمارا اب گیا گزرا زمانہ ہے!

(۲)

وطن پر مرنے والوں کی بڑی قسمت سمجھتے ہیں — یہی جنّت ہے اس کو رشکِ صد جنت سمجھتے ہیں
جنوں یہ ہے کہ تکمیلِ جنوں بھی جلد ہو جائے — مصیبت کیا مصیبت ہے اسے راحت سمجھتے ہیں
یہی جینے کی صورت ہے تو لعنت ایسے جینے پر — یہی ہے زیست تو اس زیست کو زحمت سمجھتے ہیں
کبھی تقدیر پلٹا کھائے گی اچھے دن آئیں گے — سمجھتے ہیں، مآلِ گردشِ قسمت سمجھتے ہیں
وطن پر مرنے والوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا — کسی ملت کو دنیا میں یہ کب ملت سمجھتے ہیں
فنا ہونے کے معنی ہیں حقیقت میں بقا ہونا — ہم اس کے حسنِ مطلب کو بہر صورت سمجھتے ہیں
جفا والوں سے ڈر سکتے نہیں ہرگز وفا والے — فدا ملت پہ ہیں یہ قیمتِ ملت سمجھتے ہیں
تمھیں ہے جبر سے مطلب اسی پر ناز ہے تم کو — ہمیں ہے صبر کی طاقت اسے طاقت سمجھتے ہیں
غلامی ہو کہ آزادی ہیں اک تصویر کے دو رُخ — اُسے دوزخ سمجھتے ہیں، اسے جنت سمجھتے ہیں
کسی کے قبضۂ قدرت میں رہنا کوئی عزت ہے — جو اہلِ آبرو ہیں وہ اسے ذلت سمجھتے ہیں
تمھارا کام ہے اقرار کرنا پھر مکر جانا — یہ عادت ہم سمجھتے ہیں یہ ہم خصلت سمجھتے ہیں

وفا سے کام ہے اِن کو وفا سے کام رکھتے ہیں
جفا والے عبث بسملؔ پہ سو الزام رکھتے ہیں

دل کی آگ

(از جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی)

ستم جس نے کیے ہم نے اُسے دادِ جفا دی ہے
یہ وہ شعلے ہیں جن کو اپنے دامن سے ہوا دی ہے

پتہ ظلمت میں کیا منزل کا پائیں قافلے والے
صداقت نام ہے جس شمع کا وہ تو بجھا دی ہے

دلوں میں آگ بھر کر جوڑتے ہیں رشتۂ الفت
یہ وہ حسرت ہے جس حسرت پہ دُنیا مسکرا دی ہے

فضائے ہند میں چاروں طرف شعلے بھڑکتے ہیں
یہی وہ گھر ہے جس میں آگ دشمن نے لگا دی ہے

خداوندانِ نعمت نے نہ بھولے سے ترس کھایا
بنا دینے پہ ٹکڑے دل کے بھی ہم نے دعا دی ہے

خبر کیا تھی مسیحا بن کے بھی قاتل نکلتے ہیں
سمجھتے تھے سدھر جائے گی حالت وہ دوا دی ہے

ہمارے دم نکلنے پر بھی اُف کرتا نہیں کوئی
مگر ہم نے سدا دشمن کی بھی بگڑی بنا دی ہے

تمنائیں نہ اس دل کی کبھی جھوٹوں بھی راس آئیں
فلک کی گردشوں نے غم سے دادِ التجا دی ہے

نہ ہم کو آس غیروں سے نہ اپنوں سے کوئی لہنا
کہ جیسے رسمِ الفت ہی زمانے نے اٹھا دی ہے

ملے ہیں زہر کے نشتر کرم کی التجاؤں پر
فقیروں کی طرح جس در پہ بھی ہم نے صدا دی ہے

سمجھ کر چارہ گر دشمن کو دردِ دل سُناتے ہیں
خدا ہی جانتا ہے بے کسی نے جو بنا دی ہے

دوا جس کی بجز دارُوئے الفت غیر ممکن ہے
وہی دُکھتی ہوئی رگ دل کی ظالم نے دُکھا دی ہے

دوے مظلومیت کی داد کوئی یہ تو قسمت ہے
مگر ہم نے تو غم کی داستاں سب کو سُنا دی ہے

تصادم کر کے باہم ہند کے ہندو مسلماں نے
قیامت ہے کہ بنیادِ تمنا ہی ہٹا دی ہے

وفا دشمن کہاں سے لائیں جذبے چارہ سازی کے
غلامی پر ہیں نازاں بن کے بندے بے نیازی کے

دکھائیں کس کو دل کے گھاؤ کوئی چارہ گر بھی ہے
مسیحائی کے قابل اب کہیں زخمِ جگر بھی ہے

یہ مانا چارہ گر ہی چارہ گر بالیں پہ بیٹھے ہیں
کرم کی اس نمائش میں مگر روحِ اثر بھی ہے

مداوائے مریضِ جاں بلب کرتے نہیں بنتا
مرض پہچان لے اتنا کوئی صائبِ نظر بھی ہے

اثر اُلٹے دکھائے جو ہر اکسیر نے اب تک
نہ آئی چارہ سازی راس کچھ اس کی خبر بھی ہے

بِنا اضداد پر اس کالبد کی اے مسیحا ہے
مزاج معتدل پیدا کرے اتنا اثر بھی ہے

نہ سمجھا کچھ بھی اے فطرت شناسِ دل کہ دل کیا ہے
یہ وہ نقطہ ہے جسمیں شام بھی مضمر سحر بھی ہے

کوئی آسان ہے سب کو سمو کر ایک کر دینا
ہوا بھی، خاک بھی، پانی بھی اسمیں ہے، شرر بھی ہے

مساواتِ عمل کا نام جذبِ کہربائی ہے
کشش کے واسطے اِک خاص اندازِ نظر بھی ہے

نظامِ دل جگر سے سیکھ تہذیب رواداری
محبت کی نظر کو ڈھو اِدھر بھی ہے اُدھر بھی ہے

وفا کے عہدِ رنگیں توڑ دینے کو نہیں ہوتے
محبت کی بِنا دل پر بھی ہے پندار پر بھی ہے

قیامت ہے، کہ ہم مظلوم بھی بنتے ہیں ظالم بھی
جفاؤں کے گلے بھی ہیں جفاؤں پر نظر بھی ہے

کرم کی التجا غیروں سے اور اپنوں پہ بیدادیں
دلِ بیدار بھی پہلو میں ہے اور بے خبر بھی ہے

بڑے پُر پیچ ہیں ہستی کے جادے بستیاں دل کی
نہ جانے اس کڑی منزل کے قابل راہبر بھی ہے

جہاں انسانیت دیتی ہے تعلیم وفا دل کو
ابھی اُس منزلِ تقدیس پر تیرا گزر بھی ہے

صداقت کو جگہ دے دل میں آشفتہ وفا یہ ہے
نفاق والائی کے واسطے بہتر دوا یہ ہے

بیداریٔ مشرق

(از جناب روش صدیقی)

انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب
وقت آیا ہے کہ اُٹھے روئے گیتی سے نقاب

انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب!!

اے جمالِ شمعِ آزادی کے پروانو! اُٹھو
سو چکے اے قصرِ ملت کے نگہبانو! اُٹھو
بادۂ بیداریٔ مشرق کے متانو! اُٹھو

اب جگا بھی دو بہت کچھ سو چکا ہے آفتاب!

انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

نوجوانو! اب نشاطِ کنجِ تنہائی کہاں؟
اے شجاعو! تم کہاں، یہ عیش پیمائی کہاں؟
پھونک دو محفل کو وقتِ محفل آرائی کہاں؟

دور پھینکو ساغر و پیمانہ و چنگ و رباب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

زندگی — تابندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندگی — پایندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ

زندگی ہی زندگی ہے روحِ آزادی کے ساتھ
زندہ رہنا ہے تو آزادی سے کیسا اجتناب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

اب بھی آنکھوں میں تمھاری رنگِ غفلت دیدہ ہے!
خوابِ مستقبل کی ہر تعبیر ناپوشیدہ ہے!
انتظارِ صبح کیا! صبح خود خوابیدہ ہے!
تم ہی خود بڑھ کر الٹ دو چہرِ زریں کا نقاب
انقلاب اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب

برق ہو آنکھوں میں، دل میں آتشِ پروانہ ہو
ہوش بھی آئے، تو لب پر نعرۂ مستانہ ہو
خامشی میں جرأتِ بیدار کا افسانہ ہو
زندگی کب تک، اسیرِ اعتکاف و اعتساب!
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب!

زیست کی قیمت ہی کیا ہے پیشِ مردانِ وفا
کوئی پوچھے کربلا سے رازِ پیمانِ وفا
ہاں دکھا دو، اے شجاعو! جوشِ ارمانِ وفا

بے حدود بے کنار و بے شمار و بے حساب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق انقلاب
دردِ ملّت لے کے اے ملّت کے غم خوار و چلو!
اے جوانو! اے دلیرو اے رضاکار و چلو!
منتظر ہے رحمتِ یزداں ــــ وفادار و چلو!
یونہی کھل جاتے ہیں اکثر قصرِ آزادی کے باب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

سُرخیِ خونِ وفا سے زندگی گلریز ہے
غیرتِ مزدور ـــــ برقِ خرمنِ پرویز ہے
جس کا تیشہ آج شعلہ بار و آتش خیز ہے
ہاں وہی ہے کامران و کامگار و کامیاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

شرم آئے اپنی ناکامی پہ استبداد کو!
اب نہ صیّادی کی جرأت ہو کسی صیاد کو!
تیز کر دو شعلہ ہائے فطرتِ آزاد کو!
بجلیوں سے سیکھ لو رازِ سکون و اضطراب!
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب



متین الدین ایڈوکیٹ



شاکر ناطقی



منظر اکبرآبادی



محمد اسمعیل اسلم لکھنوی

آسمانِ سرفروشی کے ستاروں کی قسم
پاکبازوں کی قسم، شب زندہ داروں کی قسم
تم کو ناموسِ وطن کے جاں نثاروں کی قسم
جاگ اُٹھو، دیکھو گے کبتک یوں ہی اُمیدوں کے خواب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

جاں نثارانِ وطن ہیں وارثِ دارالسلام
ہے بہت اونچا وطن پر مرنے والوں کا مقام
لیکن اس منزل میں اقدامِ تشدّد ہے حرام
تیغِ اخلاص و صداقت ہی ہے تیغِ کامیاب
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب

ہوشیار! اے غافلانِ حالِ بربادِ وطن!
ڈھونڈھتی پھرتی ہے تم کو روحِ ناشادِ وطن!
گر ہوا اب بھی نہ تم کو پاسِ فریادِ وطن!
آہ کیا دوگے وطن کے ذرّے ذرّے کو جواب؟
انقلاب! اے ساکنانِ ارضِ مشرق! انقلاب!

خیال وطن

(از جناب رحم علی الہاشمی مشن بلڈنگ۔ دریا گنج۔ دہلی)

ہوائے درد وطن سر میں اب سمائی ہے — بساط دل پہ شبیہ وطن بنائی ہے

ہر ایک قطرۂ خوں پر وطن وطن ہے لکھا — اسی سے جرأت ایثار ہم نے پائی ہے

وطن سے اُنس ہے سب نیکیوں میں بالاتر — وطن سے بیر بہت ہی بڑی برائی ہے

وطن فروش خطاکاروں میں ہے سب سے خوار — کہ جس نے قصر وفا کی اساس ڈھائی ہے

کہاں چمک سکے شمع حیات ظلمت میں — گھٹا فضا پہ تغافل کی ایک چھائی ہے

اُٹھو کہ ملک سے تاریکیاں ہٹا ڈالیں — اُٹھو کہ برق دواں اک نوید لائی ہے

جوانِ قوم اُٹھیں درد قومیت لے کر — کہ آزمائش دل کی گھڑی اب آئی ہے

وطن کو قوم کے ایثار کی ہے اب حاجت — ہر ایک گوشۂ دل میں صدا یہ آئی ہے

نجات غلبۂ اغیار سے وطن کو دو — وطن کے پیارو وطن کی تمہیں دُہائی ہے

بلاؤ پھر سے وطن کی وہ عظمت رفتہ — جو اپنے پاس کبھی تھی جو اب پرائی ہے

اسی کی خاک سے پیدا ہوں پھر دلاور وہ — کہ جن کے نام سے تاریخ تھرتھرائی ہے

اب امتیاز مسلمان و گبر و ہندو کیا — وطن کی خاک سے پیدا جو ہے وہ بھائی ہے

صدا خیال وطن ہاشمی نہ کیوں کر ہو
تمام عمر اسی میداں میں خاک اڑائی ہے

سیرت

(جناب مولوی متین الدین صاحب عباسی بی-اے ایل ایل بی ایڈوکیٹ لکھنؤ)

قبولِ فیض سے دنیا میں روسیاہ نہ ہو
نمودِ مہر ہو تجھ میں، نمودِ ماہ نہ ہو

ترا فروغ ہو، تیرے گداز ہی کا اثر
کسی کا عکسِ نظر، پرتوِ نگاہ نہ ہو

وہ حُسن مجھ میں ہو جس سے دلوں کی ہو تسخیر
ترا جمال، فقط، جاذبِ نگاہ نہ ہو

بسانِ شمع جلا خود کو دوسرں کیلئے
طریق سوز دکھا شانِ بزمگاہ نہ ہو

کسی سے ربط اگر ہو تو بر بنائے خلوص
اُمیدِ فیض، فقط وجہِ رسم و راہ نہ ہو

درِ فقیر پہ رکھدے جبینِ عجز، مگر
غلامِ اہلِ حشم، سرنگون جاہ نہ ہو

تری نگاہ میں ہو، امتیازِ اہلِ نظر
دیارِ حُسن میں بھی، صیدِ ہر نگاہ نہ ہو

کبھی دُھواں نہ اُٹھے، آتشِ نہاں سے تری
جگر میں آگ ہو لیکن لبوں پہ آہ نہ ہو

مریدِ خدمتِ پیرِ میکدہ ہوجا
اسیرِ بندگیِ پیرِ خانقاہ نہ ہو

ضیائے علم سے دنیا کی رہنمائی کر
جہاں میں نورِ نظر بن، غبارِ راہ نہ ہو

فقیرِ خاکِ وطن تیرا حکمراں ہوجائے
امیرِ غیر، مگر تیرا بادشاہ نہ ہو

مزدور کی عید

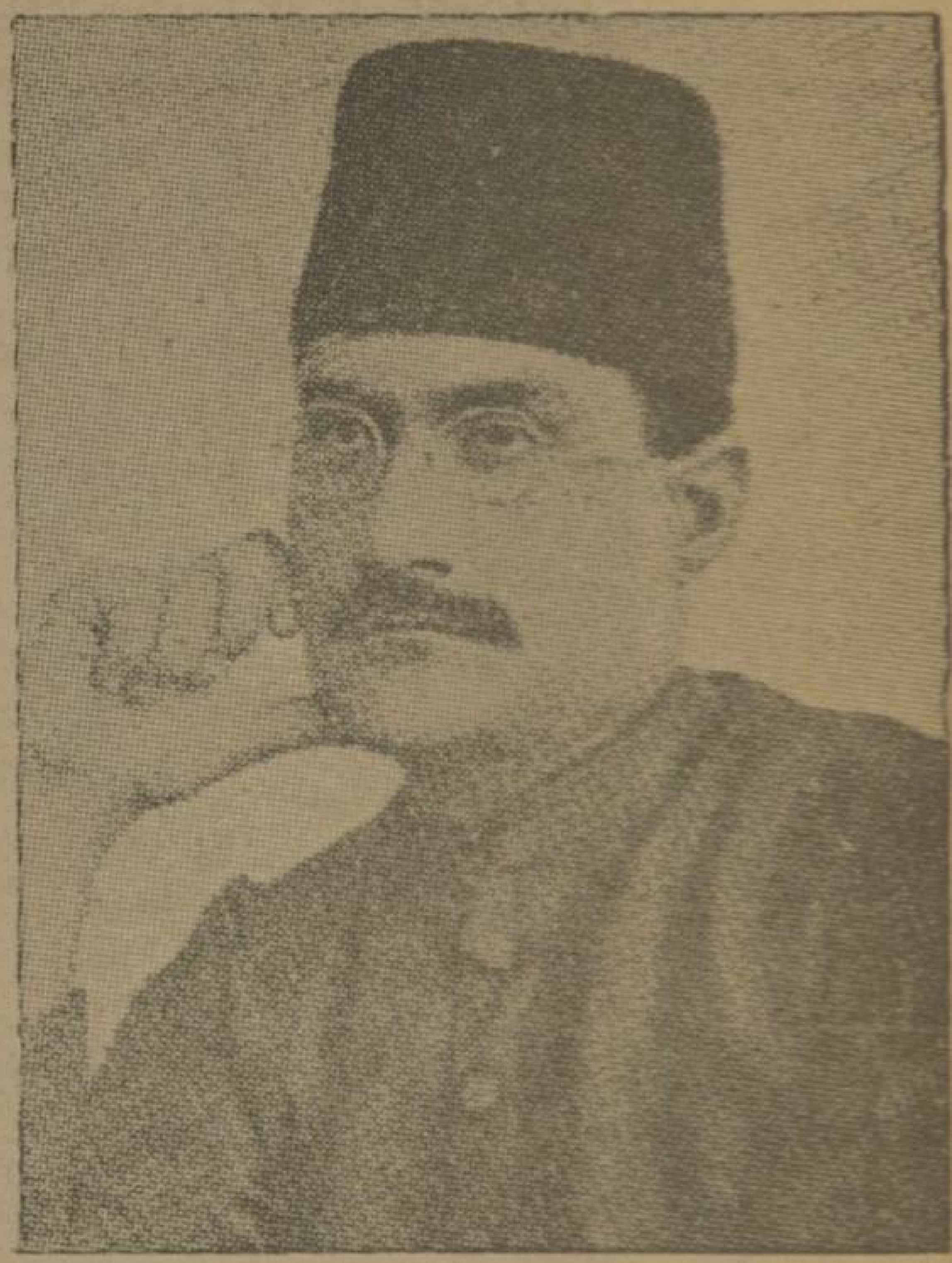
(از جناب احسان بن دانش صاحب ناظم انجمن تعمیرِ ادب مزنگ لاہور)

عید کے دن دید کے قابل ہے عالم کا نظام
ہر نظر شیرازۂ ہستی، ہر جبیں ماہِ تمام
ہر چمن فردوس منظر۔ ہر کلی جانِ چمن
نغمہ پیرائی میں گم ہیں نغمہ پیرانِ چمن
کھولتے ہیں مست جھونکے سبزہ زاروں کی شکن
آسماں پر اک صباحت ہے زمیں پر بانکپن
جمع ہیں امید بر آنے کے ساماں کو بہ کو
ڈھل رہی ہے رنگ کے سانچے میں دل کی آرزو
چپے چپے پر بپا شورِ مبارک باد ہے
شاد ہے فیضِ محبت سے زمانہ شاد ہے

(۲)

لیکن اک مزدورِ بے بس کا ہے یہ حالِ نزار
ہے ابھی نو واردانِ شہر میں جس کا شمار
عید کا دن ہے عذابِ زندگی اس کیلئے
ہر نفس ہے اک نئی شرمندگی اس کے لئے
ہے زباں پابندِ خاموشی، دلِ محزوں میں یاس
درمیانہ قد، مسیں بھیگی ہوئی چہرہ اُداس
غم کے دریا میں سفینہ ہے لبِ درخسلر کا
سایہ پیشانی پہ ہے ٹوٹی ہوئی دیوار کا
شب کو خود دھویا ہوا اک پیرہن پہنے ہوئے
جس کے دامن جابجا جھڑ کے ہوئے کٹے ہوئے
دھجیوں کو ہمنشینوں سے چھپانے کے لئے
آستینیں لوٹ رکھی ہیں بہانے کے لئے
خطِ پیشانی میں ہلکی سی پسینے کی نمود
پتلیوں میں جھلملاہٹ ہے نگاہوں میں جمود
پنڈلیوں کے بال خاکِ رہ سے گرد آئے ہوئے
ٹھوکریں لگ لگ کے دونوں پاؤں درمائے ہوئے
اشک حدِ ضبط سے باہر نکل آنے کو ہیں
دل تو ہے اُمڈا ہوا اب ہونٹ تھرانے کو ہیں

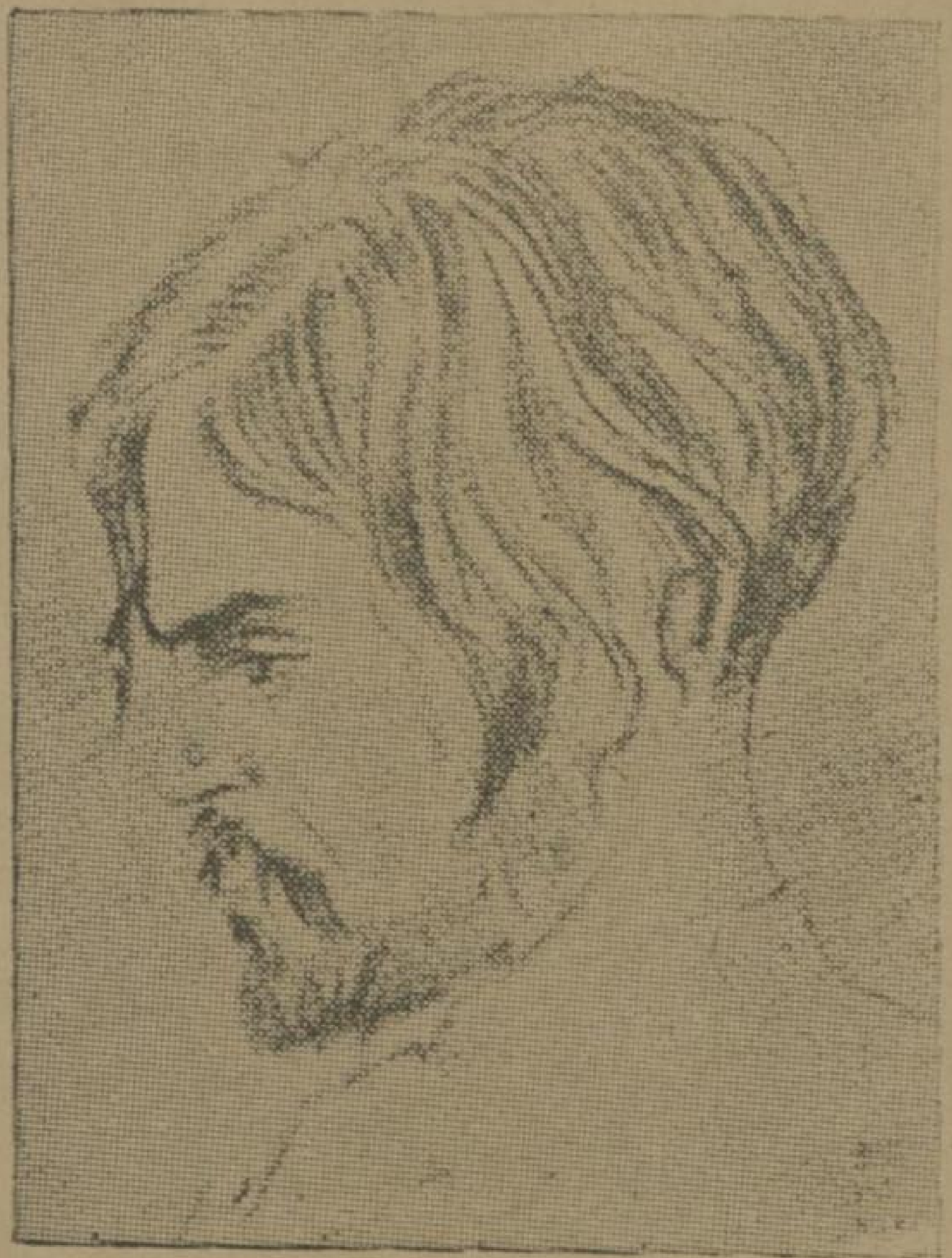
(۳)



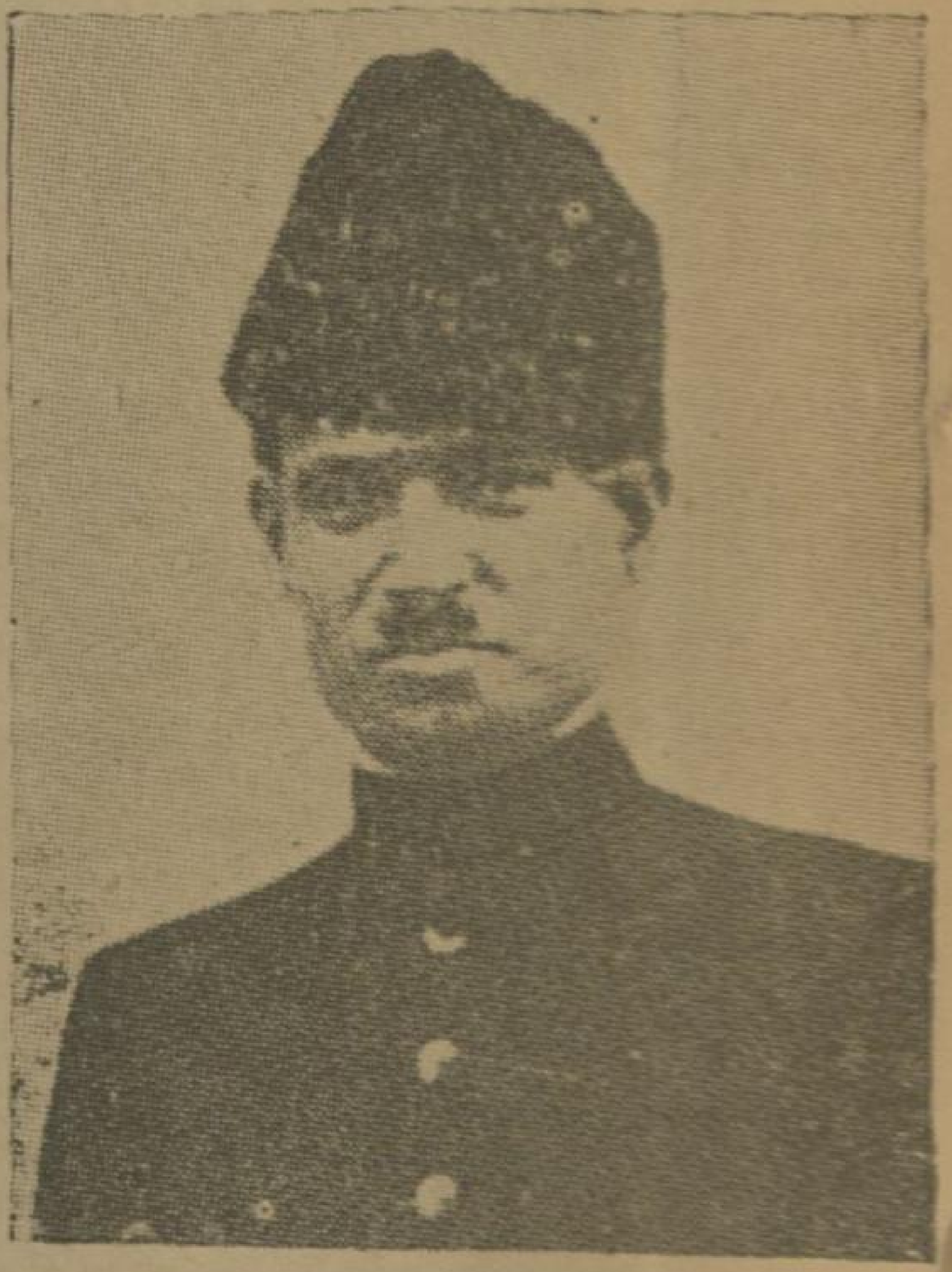
جوش ملیح آبادی



اصغر گونڈوي



جگر مرادآبادي



ساغر نظامي



سیماب اکبرآبادي

ہاتھ میں خط ہے ابھی کی ڈاک سے آیا ہوا
السلام اے میرے سرتاج و نگہبانِ حیات
جا کے تم نے عافیت کا خط کوئی بھیجا نہیں
سچ کہو یہ بے زباں بچے بھی تم کو یاد ہیں
گرچہ مجھ حسرت زدہ کی شمع کاشانہ ہیں یہ
آسماں نے اپنے اندازِ کہن بدلے نہیں
ان کا نورانی تبسم تھا تمہارے دم کے ساتھ
ابا ابا کہہ کے چونک اُٹھتے ہیں اکثر خواب سے
ماموں چندا جاؤ اب تم سے خفا ہوتے ہیں ہم
جب گلی میں کوئی شے بکتی ہوئی پاتے ہیں یہ
جب کبھی ہمسایوں کے بچے بدلتے ہیں لباس
لیکن اُف پردیس میں تم جانے کس عالم میں ہو
مطمئن رہنا مصیبت میں نہ ڈالوں گی انھیں
یہ نہ ہو خط پڑھ کے کھو بیٹھو متاعِ عقل و ہوش
دل پہ ہر دم نشۂ معصومیت طاری رہے
لے نہ جائے جوشِ خوں تاریک راہوں کی طرف
شمعِ ایماں گُل نہ ہو جائے کہ منزل دور ہے
یہ نہ ہو تقدیس کی منزل سے ہٹ جائیں قدم

جس میں ہے یہ اُس کی منکوحہ نے لکھوایا ہوا
السلام اے باعثِ نورِ شبستانِ حیات
کیا ابھی تک غم نصیبوں کا خیال آیا نہیں
جن کے ننھے دل تمہاری یاد سے آباد ہیں
لیکن اُف مجبوریاں راحت سے بیگانہ ہیں یہ
تم گئے جب سے اُنھوں نے پیرہن بدلے نہیں
مُنہ اندھیرے اشک برساتے ہیں اب شبنم کے ساتھ
ہو کے پھر مایوس کرتے ہیں گلہ مہتاب سے
تم نے ابا سے نہیں جا کر کہا روتے ہیں ہم
اشک پلکوں پر لئے چپکے چلے آتے ہیں یہ
لوٹتے ہیں آ کے مٹی میں یہ مجھ دُکھیا کے پاس
یہ نہ ہو میری شکایت سے اضافہ غم میں ہو
سیئونگی، کاتونگی، بٹ جاؤنگی، پالونگی انھیں
یہ نہ ہو دُنیا تمھیں کہنے لگے ایماں فروش
نفس کی کاوش میں صداقت کا لہو جاری رہے
راستی کا رُخ نہ پھر جائے گناہوں کی طرف
جان جاتی ہے تو جائے یہ ہمیں منظور ہے
تم کو اپنے توتلے معصوم خالد کی قسم

وائے اے نادار طبقے، وائے اے مفلس گروہ!
لوٹ لی تیری جہالت نے تری شان شکوہ

علم نے ہے اب تری جانب سے منہ پھیرا ہوا
اس لئے ہے فاقہ مستی نے تجھے گھیرا ہوا

کھو چکا تو اپنے ہاتھوں قیمت و قدر حیات
ہے بجا تجکو اگر کہہ دوں میں ننگ کائنات

تیرا سینہ دہر کی مشق جفا کے واسطے
شرم کا باعث ہے تو شرم و حیا کے واسطے

گوندھ دی غفلت نے ناداری فراغت میں تری
نقطہ نقطہ اشک بنتا ہے حکایت میں تری

ذکر پر تیرے قلم اٹھتے ہیں شرماتے ہوئے
حرف لرزاں ہیں حمایت میں تری آتے ہوئے

تیرہ تر ہیں تیری صبحیں اہل فن کی شام سے
کوششیں گردن جھکا لیتی ہیں تیرے نام سے

دور بینی کا نہیں تیری جہالت میں گزر
نام سے تیرے ترقی تولنے لگتی ہے پر

دوش جرأت سے ترا بار الم اٹھتا نہیں
تیرے میداں میں فراغت کا قدم اٹھتا نہیں

اب بھی گر چاہے تو قسمت کو جگا سکتا ہے تو
عظمت رفتہ پہ رنگ نو چڑھا سکتا ہے تو

دولت کونین جھک سکتی ہے تیرے سامنے
سانس طوفانوں کی رک سکتی ہے تیرے سامنے

ناز کر سکتے ہیں تیری ذات پر دیہیم و تاج
بازوؤں کو تیرے مل سکتا ہے عالم سے خراج

مضطرب ہے ہر سیاہی جگمگانے کے لئے
ہر خموشی دم بخود ہے گنگنانے کے لئے

آرزوئیں دل میں ویرانوں کے گلزاروں کی ہیں
حسرتیں کیا ہے کہ ہر پتھر میں تلواروں کی ہیں

سر کو دھنتے ہیں دھندلکے نور بننے کیلئے
پستیاں روتی ہیں بام طور بننے کیلئے

علم سے جب تک نہ ہو انساں کے دل میں آب و تاب
زندگی ڈالے ہوئے رہتی ہے چہرے پر نقاب

علم اک تاب و تواں ہے زندگی کے واسطے
زندگی کے واسطے پائندگی کے واسطے

علم کے بل پر انوکھی چال چل سکتا ہے مرد
اپنی بد حالی کے کانٹے کو بدل سکتا ہے مرد

نعرۂ شباب

(از حضرت جوشؔ ملیح آبادی مدیر "کلیم" دہلی)

ہوشیار، اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار!
اُڑ گیا روئے نگارِ آسماں سے رنگِ خواب
ہٹ، کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
اے قدامت! یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار!
کام ہے میرا "تغیر" نام ہے میرا "شباب"
کوئی قوت، راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں
رنگ سورج کا اُڑاتا ہے مرے سینے کا داغ
سنگ و آہن میں مری نظروں سے چبھ جاتی ہے پھانس
دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے

الاماں، اے کبر و ریا آلودہ پیری! الاماں
ہاں، تو ہی ہے وہ، جنوں نے جسکے ٹکڑے کر دیا
ہو جو غیرت، ڈوب مر، یہ عمر، یہ درسِ جنوں
یہ ستم کیا، اے کنیزِ کفر و ایماں! کر دیا
کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کوتہ خیال

اے خلشِ نا آشنا پیری و شیبِ ہرزہ کار!
جھلملاتی شمع! رخصت ہو، کہ اُبھرا آفتاب!
خلق واقف ہے، کہ جب آتا ہوں، چھا جاتا ہوں میں!
بھاگ، وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار!
میرا نعرۂ "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"!!
کوئی ضربت، میری گردن کو جھکا سکتی نہیں!
بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رُخ میرا چراغ!!
آندھیوں کی میرے میداں میں اُکھڑ جاتی ہے سانس!!
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے!!!

اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں!
سبحہ و زنّار کی اُلجھن میں رشتہ قوم کا!
دشمنوں کی خواہش تقسیم کی صید زبوں
بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قربان کر دیا
جُھریاں ہیں یہ ترے مُنھ پر، کہ غدّاری کا جال

دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو، اے دھندلی نگاہ! سر بھڑک اٹھتا ہے، لیکن، ہے ابھی تک دل سیاہ!
پیٹ کے بل، ناسزا! پنجاب میں رینگی تھی تو تیری اس بے غیرتی پر گرم ہے اب تک لہو!
ابن آدم، اور رینگے خاک پر! اللہ رے قہر!! سانپ کا اس رینگنے سے آگیا ہے مجھ میں زہر!!
بولے منہ! ختم کر یہ "عاقبت بینی" کا شور دیکھ اب، بزدل! مری "ناعاقبت بینی" کا زور
چہرۂ امروز ہے میرے لئے ماہِ تمام خوفِ فردا ہے مری رنگیں شریعت میں حرام
تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی اونگھتی، گڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی
تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش "کفر و ایماں"، "کفر و ایماں" تا کجا؟ خاموش باش!
حبِ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا، کچھ بھی نہیں تیرا ایمان چند وہموں کے سوا، کچھ بھی نہیں!
تیرے جھوٹے "کفر و ایماں" کو مٹا ڈالوں گا میں ہڈیاں اس "کفر و ایماں" کی چبا ڈالوں گا میں!
ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرحِ نو "اجمیر" اور "پریاگ" میں جھونک دوں گا "کفر و ایماں" کو دہکتی آگ میں!
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زر فشاں ثبت ہوگا جس کی زریں جلد پر "ہندوستاں"
اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے واروں گا میں تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں
پھر، اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا!
ولولوں سے، برق کے مانند لہرایا ہوا موت کے سائے میں رہ کر، موت پر چھایا ہوا!
خون میں لتھڑی لبادا کفر و دیں اُلٹے ہوئے فخر سے سینے کو تانے، آستیں اُلٹے ہوئے!

کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لاؤں، تو سہی
اک نیا سنگم زمانے میں بناؤں، تو سہی

ہندوستان

(از جناب مولانا سیماب اکبرآبادی)

وہ پرستش گاہِ فطرت، سجدہ گاہِ آفتاب
گردگارِ صبحِ مشرق، شامِ گیتی کا شباب

تھا صنم زارِ عرب جس کے صنم خانوں کی دھوپ
آتشِ بزمِ عجم تھی جس کے ایوانوں کی دھوپ

بتکدوں میں جس کے زندہ تھے بتانِ آذری
عشق کی پروردگاری، حسن کی پیغمبری

سرخ صندل سی جبینیں ان پہ قشقوں کے چراغ
برگ سے نازک طبیعت، پھول سے نازک دماغ

جس کے دریا آئینے، پگھلے ہوئے بہتے ہوئے
جس کے پربت کائنات ابر کو گھیرے ہوئے

جسکی ندیاں موج سے کسطرح لہراتی ہوئی
گھومتی، گرتی، گزرتی، گونجتی، گاتی ہوئی

شام مستی آفریں، رنگِ سحر جلوہ پناہ
عشق کی پہلی جماہی، حسن کی پہلی نگاہ

لہلہاتے سبزہ زاروں میں بہار آئی ہوئی
اک گھٹا برسی ہوئی، اور اک گھٹا چھائی ہوئی

جیسے رقصاں ہو فضا میں حسن کا رنگیں خدنگ
مختلف رنگوں کا جیسے اڑ رہا ہو اک پتنگ

دیکھ کر افغانیوں نے اس کی پروازِ جمیل
لے لیا آغوشِ قوت میں باندازِ جمیل

مل گئی شمعِ حرم بتخانے کے فانوس سے
ابنِ آذر نے اذاں دی پردۂ ناقوس سے

مسلکِ بودھ کو تحفظ کا اشارہ مل گیا
کرشن کے مندر کو مسجد کا سہارا مل گیا

ذرہ ذرہ محملِ زہرہ نظر آنے لگا
خون سا قشقہ ثریا بن کے اترانے لگا

رایتِ مسلم نے پرچم کہکشاں پر رکھ دیا
چند صدیوں میں زمیں کو آسماں پر رکھ دیا

ہند، علم و فضل و رعنائی کا گہوارہ بنا
یہ پتنگ اتنا ہوا اونچا کہ سیارہ بنا

شامِ مغرب، یہ ستارہ دیکھ کر للچا گئی — سادہ و بے نور آنکھوں میں چکا چوند آگئی
فلسفی بھی دام لے کر بڑھے تجار بھی — اپنا پھندا لے کے اُٹھا دیوِ استعمار بھی
عرشِ سطوت پر تھی موجِ عشرت افغانیاں — جلوۂ ساغر سے تھیں چمکی ہوئی مہتابیاں
تھیں یہی دو چار باتیں گرمیٔ بزمِ شباب — نغمۂ مطرب، کنارِ شاہد و جامِ شراب
کارواں غافل ہوا، رعبِ شبِ منزل گیا — پاسبانِ وقت کو، شبخوں کا موقع مل گیا
شامِ مغرب صبحِ مشرق پر یکایک چھا گئی — سُرخ اک بدلی زمیں سے آسماں تک چھا گئی

اب وہ سیارہ، جو رفعت پر سبک پرواز تھا
پستیٔ حالات سے پھر نقشِ پا انداز تھا

آہ، اے ہندوستاں! یہ تیری پستی وہ شباب — کچھ تری تقدیر ہی میں فطرتاً ہے انقلاب
گو بظاہر تو نشاطِ ندرتِ ایام ہے — فی الحقیقت بے سکوں، بے چین، بے آرام ہے
وہ بہاریں، وہ چمن، وہ گلشنِ ایجادی کہاں؟ — اے غلام آباد، اب وہ تیری آزادی کہاں؟
بحر و بر تیرے وہی ہیں اور تو بے اقتدار — ایک ذرّے، ایک قطرے پر نہیں ہے اختیار
اب بھی میدانوں میں بچھتی ہے بساطِ ماہتاب — تیری موجِ خاک سے اب بھی برستے ہیں گلاب
روح سے خالی ہے لیکن پیکرِ مُردہ ترا — جلوہ پژمردہ ہے تیرا، باطن افسردہ ترا
جیسے شمعِ صبحِ محفل، جیسے چھپتا آفتاب — جیسے شاعر کا بڑھاپا، اور بیوہ کا شباب

پستیوں کو ارتقا پھر جلوۂ آغاز دے
کاش مستقبل ترا ماضی کو پھر آواز دے

اپنے وطن سے پیمانِ وفا

(محمد اسمٰعیل اسلم لکھنوی)

جب بجھائے جائینگے حق و صداقت کے چراغ
جب کئے جائیں گے ویراں حریت کے سبز باغ
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

جب زبانیں نام لینے پر ترے ہوں گی قلم
بیگناہوں پر کئے جائینگے جب جور و ستم
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

جب چلے گا حلق پر خنجر مرے جلاد کا
دَور دورہ ہوگا جب عالم میں استبداد کا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

جاں نثاروں کا ترے جب خون بہایا جائے گا
دار پر جب بچے بچے کو چڑھایا جائے گا
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

جب جلا ڈالے گی گر کر برق میرا آشیاں
جب مٹانے پر مرے آمادہ ہوگا آسماں
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

جب بہیں گی دہر میں نہریں ہر اک سو خون کی
جب میں جکڑا جاؤں گا زنجیر میں قانون کی
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

جب جفائیں پر جفائیں مجھ پہ ڈھائی جائینگی
خاک میں جب عظمتیں میری ملائی جائیں گی
اے وطن اسوقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

ذرہ ذرہ میں نظر آئیں گی جب بربادیاں
چھین لی جائیں گی مجھ سے جب مری آزادیاں
اے وطن اس وقت بھی میں تیرے نغمے گاؤں گا

ظلم کی جب سُرخ عالم میں چلیں گی آندھیاں
جب گرائی جائیں گی غم کی دلوں پر بجلیاں

اے وطن اسوقت بھی مَیں تیرے نغمے گاؤں گا

مختصر یہ ہے کہ جب ہوگا لبوں پر دم مرا
اور فرشتہ موت کا ہوگا سر بالیں کھڑا

اے وطن اس وقت بھی مَیں تیرے نغمے گاؤں گا

سندھ ندی

"گانڈربل کشمیر میں"

(جناب میر محمود ولی امرتسری)

سندھ ندی آ رہی ہے زمزمے گاتی ہوئی — کہکشاں صورت خرامِ ناز دکھلاتی ہوئی
چھپ گئی تھی لے کر اپنا حسن ستر ابر میں — مہر کی چشمِ حریصانہ سے گھبراتی ہوئی
سانس لینے بھی نہ پائی تھی ابھی کہسار میں — پستیوں کی سمت لڑھکی ٹھوکریں کھاتی ہوئی
سنگ پاروں کو چٹانوں کو تہ پا روندتی — موتیوں پر موتیوں کا مینہ برساتی ہوئی

کس قدر ہے دخترِ کہسار کی مستانہ چال
ناشناسائے غلامی ہے یہ آزادانہ چال

خیر مقدم کیلئے ہنستی ہوئی آئی بہار — کیف برسانے لگا رنگِ فضائے بے غبار
شوق سے غنچے نے آغوشِ محبت کھولدی — دیدۂ نرگس بنا سر سے قدم تک انتظار
گل کی پیراہن دری سے ہے عیاں دیوانگی — لطف کا دریوزہ گر ہے لالۂ خونناب بار
وادیاں آراستہ ہیں جل پری کیواسطے — سبزہ پر ہے سبز مخمل کے بچھونے کا نکھار

کسقدر ہے دخترِ کہسار کی مستانہ چال
ناشناسائے غلامی ہے یہ آزادانہ چال

جا رہی ہے یہ کہستان و دمن کو چھوڑ کر
گھاٹیوں کے حلقۂ بند رسن کو چھوڑ کر

دشت و ویرانہ میں ہوتا ہے کبھی اس کا گزر
سنگ زار و وادی و کشت و چمن کو چھوڑ کر

سبزہ سے ہو کر جدا صحرا میں گھبراتی نہیں
کھیلتی ہے ریگ پاروں سے سمن کو چھوڑ کر

اس سکوں دشمن مسافر کا وطن کوئی نہیں
ڈھونڈھتی ہے جائے تو جائے کہن کو چھوڑ کر

کس قدر ہے دختر کہسار کی مستانہ چال
ناشناسائے غلامی ہے یہ آزادانہ چال

نالۂ جرس

(حضرت جمیل مظہری ۔ از کلکتہ)

بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں! غرورِ کارواں ہو تم
جہانِ پیر کے لئے شبابِ جاوداں ہو تم

بہ نقشِ پائے رفتگاں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

اٹھائے سر بڑھے چلو تنے ہوئے غرور سے
تمہارے قافلے کی شان دیکھتی ہیں دور سے

ہمالیہ کی چوٹیاں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

سلام موجِ گنگ لو مجاہدانِ حریت
ہیں گلفشاں بہشت سے پیمبرانِ حریت

کھلا ہے عرصۂ جہاں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

خرابِ بادۂ خودی مے عمل پئے ہوئے
علم بدوش و صف بہ صف کلاہ کج کئے ہوئے

مثالِ بحرِ بیکراں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

بڑھے ہوئے ہوں حوصلے چڑھی ہوئی ہوں آستیں
بدل دو صورتِ جہاں الٹ دو صفحۂ زمیں

پلٹ دو دورِ آسماں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

قسم تمھارے عزم کی فدا تمھاری شان کے — بڑھا کے ہاتھ توڑ لو ستارے آسمان کے
جھکا دو شاخِ کہکشاں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

بنائے کہنہ توڑ دو بناؤ اک جہانِ نَو — جہانِ نَو جہانِ نَو بہ سقفِ آسمانِ نَو
نئے مکیں نیا مکاں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

نہ ہو سوالِ یں و آں نہ ہو تمیز بحر و بر — عبث ہے خوفِ تیرگی ستارے چھپ گئے اگر
چمک رہی ہیں بجلیاں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

بجھے نہ شمع دل کہیں ہوا ہے تیز باغ کی — اگر اندھیری رات ہے بڑھا دو لو چراغ کی
گرج رہی ہیں آندھیاں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

جنابِ خضر پیر ہیں لکیر کے فقیر ہیں — کہاں کا ساتھ دیں گے کیا وہ نوجواں جو تیر ہیں
چو تیر جستہ از کماں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

جو عقل راہ روک دے تو اس کا ساتھ چھوڑ دو — جو مذہب آ کے ٹوک دے تو اس کی قید توڑ دو
ہوا کی طرح سرگراں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو
برادرانِ نوجواں — بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

رکے نہ پائے جستجو بچھے ہیں خار راہ میں
جھکے نہ پرچمِ علم کھڑے ہیں دار راہ میں

مثالِ گردِ کارواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

کھلے ہیں پھول زخم کے اجل گلے کا ہار ہے
لہو سے سرخ ہیں کفن یہ مژدۂ بہار ہے

نثارِ تیغِ خونفشاں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

سنو مری صدا سنو درائے کارواں ہوں میں
تخیلاتِ ستم کش کی دکھ بھری فغاں ہوں میں

قدم بڑھاؤ مہرباں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

غریب بچے قوم کے بلک رہے ہیں بھوک سے
خدا کا عرش ہل رہا ہے مامتا کی ہوک سے

گرے نہ سر پہ آسماں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

فسانہائے بیکسی زبانِ درد سے سنو
اگر ہو پہلوؤں میں دل ہوائے سرد سے سنو

پیامِ اشکِ بیکساں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

جو راہبر بچھڑ گئے نہیں مقامِ پیش و پس
جو ہمسفر بچھڑ گئے تو چھیڑ دو "نالۂ جرس"

سنو جمیلؔ کی فغاں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

برادرانِ نوجواں
بڑھے چلو۔ بڑھے چلو

گلہائے عقیدت

معروف بہ جذبۂ وطن پرستی

جناب مرزا محمد جعفر حسین خاں صاحب بہادر کوکب شیش محل لکھنؤ

(۱)

صہبائے زندگی تھے جلوے کبھی وطن کے — یا آج دل شکن ہیں نظارے انجمن کے
ٹکڑے اڑا اڑا کے دامان و پیرہن کے — پھولوں نہیں سماتے کانٹے چمن کے
یوں روح کھنچ گئی ہے ہنستے ہوئے گلوں کی
آواز پڑ گئی ہے شیون سے بلبلوں کی

(۲)

ہر ذرہ چمن پر کیا اوس پڑ گئی ہے — چھائی ہوئی ہے زردی حسرت برس رہی ہے
کیا چیز چھن گئی ہے کس بات کی کمی ہے — ہر پھول ہر شجر سے مفقود زندگی ہے
قبضہ میں بے حسی کے دنیائے آب و گل ہے
غفلت پسندیوں میں سرشار بزم دل ہے

(۳)

ہر اہل دل ہمارا تقدیر پر ہے شاکر — بازوئے شل کی صورت تدبیر سے ہے قاصر
ترک خودی کا عامل ترک عمل پہ قادر — ہر فعل و ہر عمل سے کم ہمتی ہے ظاہر
کمزور و مضمحل ہو جب قوت ارادی
پھر کیوں نظر نہ آئے ہر سمت نامرادی

اے حریت کے طالب اے حقیت کے طالب (۴) کھوئی ہوئی حکومت یا سلطنت کے طالب
نام و نشاں کے جویا مقبولیت کے طالب — تیرے بلند ارادے ہیں منفعت کے طالب
لیکن ترے جنوں کی تکمیل ہو تو کیوں کر
اس واہمہ کی آخر تشکیل ہو تو کیوں کر

(۵)

ہر سمت برہمی ہے ہر سمت ابتری ہے — اس برہمی کا باعث اخلاق کی کمی ہے
تیرا ہر ایک جذبہ در اصل عارضی ہے — جس کا برا نتیجہ اک عام بدظنی ہے
ان بدگمانیوں کا جلدی علاج کر لے
حسن عمل سے اپنے حاصل خراج کر لے

(۶)

خود غرضیوں پہ اپنی مسرور ہونے والے — اس خبث باطنی پر مغرور ہونے والے
شیدائے قوم و ملت مشہور ہونے والے — ہر شے کی اصلیت سے او دور ہونے والے
بغض و حسد کے بندے جویائے کامرانی
تو عمر بھر رہے گا محروم کامرانی

(۷)

یہ مذہبی تعصب اک دائمی عداوت — یہ جوش اعتقادی اک مستقل جہالت
یہ واہمہ پرستی کمزور ہی طبیعت — پابندی مراسم اندیشۂ ملامت
راہیں ترقیوں کی مسدود ہوں نہ کیونکر
آثار زندگی کے نابود ہوں نہ کیونکر

(۸)

اپنے ہی فائدہ کی ہر وقت جستجو ہے | یہ کونسی ہے خصلت یہ کس طرح کی خو ہے
کیا صرف اک تجھی کو دنیا کی آرزو ہے | ساری مصیبتوں کی بنیاد و اصل تو ہے

دولت کی تجھکو خواہش عہدوں کی تجھکو حسرت
اے پیکرِ تمنّا اے بندۂ جہالت

(۹)

میونی سپلٹی کی کونسل کی ممبری کی | سر کا خطاب پایا ڈپٹی کمشنری کی
ہاں ہاں گورنری کی دنیا کی خود سری کی | قوم و وطن کے حق میں کیا تو نے بہتری کی

ان کے حقوق چھینے اُن کے گلے کٹائے
بے موت ان کو مارا ظلم ان پہ ڈھائے

(۱۰)

انسانیت کے معنی دنیا میں کامرانی | ایثار کر کہ تجھ کو حاصل ہو شادمانی
دُنیا میں یوں بسر کر تھوڑی سی زندگانی | رہ جائے بعد تیرے تیری کوئی نشانی

ہر فرد بشر پر واجب ہیں کچھ فریضے
جن سے کہ ہوں مرتب اچھے ہی سب نتیجے

(۱۱)

ہمسائے سے رعایت محتاج کی اعانت | بیمار کی عیادت مجبور کی حمایت
بیوؤں کی سرپرستی ایتام پر بھی شفقت | اصلاح کبر و نخوت قوم و وطن کی خدمت

اسباب اور علل پر دار و مدار دُنیا
تیری ہی زندگی پر ہے انحصار دنیا

(۱۲)

اولاد سے محبت ماں باپ کی اطاعت احباب سے عقیدت اغیار سے مروّت
تحصیل علم و حکمت کسب معاش و دولت دولت بقدر حاجت محنت بقدرِ قدرت
پابندیٔ فرائض اور دل کی کچھ خوشی بھی
کچھ سیر کچھ سیاحت کچھ لطف زندگی بھی

(۱۳)

ترتیب کی ضرورت تنظیم کی ضرورت اصلاح کی ضرورت تعلیم کی ضرورت
تنسیخ کی ضرورت ترمیم کی ضرورت سچ پوچھئے تو اب ہے تقدیم کی ضرورت
دنیا ترقیوں کی راہوں پہ گامزن ہے
ہر ملک دہر وطن میں اس کی اِک انجمن ہے

(۱۴)

صنعت کے ہوں ادارے حرفت کے ہوں ادارے جنمیں کہ کام سیکھیں اہلِ وطن ہمارے
ہیں قابل توجہ یہ دل شکن نظارے مزدور اور مزارع ذی روح کے سہارے
فاقہ کشی کے مارے ہیں نیم جان اب تو
فریاد ان کی سن لے اے آسمان اب تو

(۱۵)

ٹوٹے ہوے دلوں کی اے بیوفا دعا لے روٹھے ہوؤں کو اپنے للہ اب منالے
سہمے ہوئے ہیں تجھ سے ظالم گلے لگالے قم کہہ کے اے مسیحا اب تو انھیں جلالے
ان دل دُکھے ہوؤں کی تجھ پر مدد ہے واجب
اب حد سے بڑھ گئے ہیں آزار اور مصائب

(۱۶)

سرمایہ دار تیرے نادار ہو گئے ہیں   مجبور ہو گئے ہیں ناچار ہو گئے ہیں
سب حوصلے جوان کے مسمار ہو گئے ہیں   اس زندگی سے اپنی بیزار ہو گئے ہیں
اسباب بے نوائی کیا میں تجھے بتا دوں
اس کے وجوہِ اصلی آئیں تجھے سنا دوں

(۱۷)

یہ شدت محاصل یہ ٹیکسوں کی کثرت   یہ دعوتیں انھیں کی جن سے کہ کوئی حاجت
چندے نمائشی کچھ جن کی نہیں ضرورت   فیشن پہ پیتیوں کی دلدادہ ہر ریاست
جاہ و جلال و عظمت گویا سراب ہستی
یا ظاہری نمائش یا ایک خواب ہستی

(۱۸)

لوٹا ہمیں ہر اک نے لوٹا گیا جہاں تک   اُجڑے ہوئے پڑے ہیں ایوان خسرواں تک
نادر بنا ہوا تھا ہر نادری جواں تک   ہندوستاں کی دولت پہنچی کہاں کہاں تک
طوفاں جہاں سے اُٹھے آئے اسی زمیں پر
محمود غزنوی نے حملے کئے ہمیں پر

(۱۹)

دُنیا کی پڑ رہی ہیں ہم پر بُری نگاہیں   لازم ہوا کہ مل کر ہر ایک سے نباہیں
قربان ہوں وطن پر مذہب کو بھی سراہیں   اپنا یہی ہے مسلک اپنی یہی ہیں راہیں
گوتم کی شاہ راہیں سرنامۂ ورق ہوں
اکبر کے کارنامے سرمایۂ سبق ہوں

(۲۰)

یہ باہمی تصادم آزادیوں کا دشمن — آویزشِ مذاہب بربادیوں کا مخزن
ہر ذرہ اس زمیں کا مانندِ چرخِ پُر فن — ان بجلیوں کی رو سے محفوظ جب ہو خرمن
برھم نہ ہونے پائے رنگ اپنی محفلوں کا
اِک نقطۂ نظر پر سنگم ہو سب دلوں کا

(۲۱)

سوراج اپنا کوکب اپنی وطن پرستی — سیوا اگر دجیو کی برباد ہو نہ ہستی
لوٹی ہوئی ہے نگری اُجڑی ہوئی ہے بستی — خمیازہ کش ہوئی ہے ہمت فروز ہستی
اُٹھو شکستہ خاطر سر اپنا وارتے ہیں
شیدائے ملک و ملت تم کو پکارتے ہیں

جمنا

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

جس کے پائے ناز مسجودِ فقیر و شاہ تھے
جس کے ساحل تیر اندازوں کے جولانگاہ تھے
چاندنی میں جسکی ٹھنڈی ریت پر سوتے تھے تم
نیلگوں دھارے میں جس کے غوطہ زن ہوتے تھے تم
جس نے پانڈو کے دلِ ویراں کو بخشی زندگی
جس کی بیکل موج بھی تسکین کا اک جام تھی
ساحلوں پر جسکے صحرائے لق و دق تھا کبھی
جو درندوں اور حیوانوں کا تھا ملجا کبھی
ذوق نے اُلفت کے جس کو رشکِ گلشن کر دیا
گل بدامن کر دیا جنت بدامن کر دیا

جس کو پانڈو نے سنوارا کیا وہ دوشیزا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
جسکے آگے سرد تھا قلزم وہی دریا ہے تو
جس کے پاکیزہ کنارے مندروں کے شہر تھے
جس کے قطرے دیکھنے والوں کو رشکِ بحر تھے
جسکی گودی میں ہزاروں قلعے تھے لاکھوں چمن
جسکی موجوں میں بہا کرتی تھی دنیا اور دھن
جو کبھی صورت نمائے کوثر و تسنیم تھی
جسکے ساحل پر گھنے کنجوں کی اک فردوس تھی
جس کے ساحل سے بہادر زندگی پاتے رہے
ارجن و بھیم و یدھشٹر گرز چمکاتے رہے
آسماں جنت کے موتی جسپہ برساتا رہا
آریہ عظمت کا جھنڈا جسپہ لہراتا رہا

جس کو جوہر نے تراشا تھا وہی ہیرا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
تو عروسِ گلستاں دوشیزۂ صحرا ہے تو

جس کے سینہ پر کنول کے پھول کھلتے تھے کبھی ساری دنیا کے خزانے جس میں پلتے تھے کبھی
جس کی چوٹی موتیوں کی کان تھی ہیروں کی جان بھیک جس سے مانگتے تھے نور کی ہفت آسماں
جسکی چھاتی گوشۂ آغوش مادر تھی کبھی جس کی گودی امن اور راحت کا مندر تھی کبھی
جو کبھی میٹھے سروں میں گا کے بہلاتی بھی تھی اور کبھی پیڑوں کے سائے میں سلاجاتی بھی تھی
فرض کو اپنے اگر ہم بھول جاتے تھے کبھی بیخودی میں عیش کی محفل جماتے تھے کبھی
تندخو موجوں کے نغموں سے جگادیتی تھی تو اُٹھ کے اپنے پاؤں کے گھونگرو بجادیتی تھی تو

محفل ہندوستاں کی مست رقاصہ ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو کرشن کی بنسی کا اک بہتا ہوا نغمہ ہے تو
دیوکی ہر صبح جس کے گھاٹ پر آتی رہی بطن میں گوکل کے پیغمبر کو بہلاتی رہی
نغمۂ گوتم کنارے پر ترے گونجا کیا بنسری کا مست تیری گود سے پیدا ہوا
ترے ساحل پہ بھی آیا پریشاں واسدیو کنس کا مارا ہوا مقہور و حیراں واسدیو
کنس کے ظلم و ستم کی سخت ہیبت دل پہ تھی گوردھن پر اک نظر تھی اور اک ساحل پہ تھی
یاد ہے اب تک ترا طوفاں اُٹھانا یاد ہے گوردھن کو دیکھ کر موجوں پر آنا یاد ہے
کس قدر جادو بھرا تھا شوقِ پابوسی ترا تیری بیتابی پہ آخر کرشن کو رحم آگیا
کرشن نے اپنا قدم موجِ رواں پر رکھ دیا تاج الفت کا وفائے آستاں پر رکھ دیا
بوسے دے کرشن کے قدموں کو تو بہنے لگی مائلِ مقصود محو جستجو بہنے لگی
نزہت آغوش تھی بازیچہ تھی گہوارہ تھی آسمانِ ہند کا بہتا ہوا سیارہ تھی
کیا تجھے وہ کرشن کا گیندیں اُڑانا یاد ہے ساحلوں کو اپنا بازیچہ بنانا یاد ہے

گنبد کا موجوں پہ گرنا کودنا وہ کرشن کا
اژدہے کا سا نورے پیکر پہ کنڈل مارنا

کرشن کا اس وقت بھی بنسی بجانا یاد ہے
ناچنا اور تیری موجوں کو نچانا یاد ہے

ناگ کے پھندے سے بچکر باہر آنا یاد ہے
سب سے پہلا درس آزادی سنانا یاد ہے

گوپیوں کا وہ سرِ ساحل نہانا یاد ہے
کرشن کا رنگیں لباسوں کو چرانا یاد ہے

ہر سحر جس کی سحر تھی اور ہر شب چاندنی
ادھ کھلی کلیوں کی خوشبو سے مرکب چاندنی

جو مدھر مرلی کی لے پر عمر بھر بہتی رہی
کرشن سے افسانۂ شام و سحر کہتی رہی

عمر بھر جو زندگی کی پند فرماتی رہی
موجِ گل جس کی روانی کی قسم کھاتی رہی

شام کے ہلکے دھندلکے میں یہ اندازِ حجاب
چھیڑتی تھی کنج میں رادھا محبت کا رباب

حسن کا گہوارہ تھی دار الامانِ عشق تھی
جس کی ہر موجِ رواں آرامِ جانِ عشق تھی

کرشن جس میں تیرتے تھے کیا وہی دریا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
عظمتِ ماضی کا دھندلا سا اک آئینہ ہے تو

جس کا ساحل تھا شکست و فتح کی جولانگاہ
جس کا ساحل دیس بھگتوں کی تھی اک قربانگاہ

جس کی ریتی تھی شہیدوں کیلئے نوری کفن
خون کے قطروں سے جو بنتی رہی رشکِ چمن

تھی چتا ہر موج جسکی جلنے والوں کیلئے
اور اک قبرِ رواں تھی مرنے والوں کیلئے

انجمِ یونانیاں چمکا تری آغوش میں
باختر کا کارواں اترا تری آغوش میں

تیری گردن پر کبھی افغان کی شمشیر تھی
اور کبھی مغلوں کے نیّر بوس نیزوں کی انی

خود تجھے اکثر ترے بیٹوں نے بھی زخمی کیا
آریوں نے اپنے خوں سے بھی تجھے بھر بھر دیا

جس کے ساحل عظمتِ تیمور کی ہیں یادگار
جس کے ساحل حشمتِ بابر کے ہیں آئینہ دار

دولتِ تیمور کی جاہ و جلالت دفن ہے　　تیرے ساحل پر مسلمانوں کی عظمت دفن ہے

مرثیہ خوانِ جلال و حشمت رفتہ ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو　　صحبتِ ماضی کا اک پر درد افسانا ہے تو

شانہ گیری شہ جہاں کو تیرے گیسو کی ملی　　مر کے بھی کی جذبۂ ممتاز نے مشاطگی

ایک کوہِ نور دامن پر ترے ٹانکا گیا　　جو تری آبی ڈلائی کے لئے تارہ بنا

تاج سے راتوں کی خاموشی میں کیا کہتی ہے تو　　آگے اسکی گود میں آہستہ کیوں بہتی ہے تو

تیرے ساحل پر کہاں پہلی سی وہ آبادیاں　　اب نہ وہ قلعے نہ وہ جھنڈے نہ پرچم اور نشاں

اب کہاں وہ عظمتیں وہ دبدبے اور وہ جلال　　شام لاتی ہے کہاں تیرے لئے تاروں کی شال

رات کو انجم تری زلفوں سے اب ملتے نہیں　　صبحدم موجوں پہ تیری اب کنول کھلتے نہیں

اب کہاں چہرے سے تیرے نورِ عشرت کا ظہور　　اب کہاں آنکھوں میں تیری رنگ دنیائے سرور

تیرے پیکر پر لباسِ زندگی ہے تار تار　　تیرے ساحل پر نہ گلشن ہیں نہ گلشن کی بہار

سنکھ کے نغمے ہیں مندر میں نہ مسجد میں اذاں　　اور نہ ساحل پر ترے وہ دیویاں وہ گوپیاں

آہ وہ تیرے زمانے اک فسانا ہو گئے　　ناچتے تھے مور جن کنجوں میں وہ کیا ہو گئے

یادگارِ حشمتِ تاریخ دیرینا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو　　جنگلوں میں ہند کے اک تشنہ لب بڑھیا ہے تو

غاصبوں کے سم زدہ تیروں سے جو زخمی ہوئی　　جس کی چھاتی نیزۂ اغیار سے چھلنی ہوئی

جس کا ہر ربطِ امتدادِ وقت نے ٹکڑے کئے　　جس کی موجیں پڑھ رہی ہیں زندگی کے مرثئے

جس کی ہر موج رواں ہے آج اک ساز خموش
جس کی لہروں میں نہیں پہلا سا وہ جوش و خروش

جوش نادر موج زن جسکے کنارے کٹ گئے
کاٹتے تھے جو سمندر کو وہ دھارے کٹ گئے

جسکی آنکھیں آنسوؤں سے پر ہیں اور دل بیقرار
جسکا دامن ٹکڑے ٹکڑے اور گریباں تار تار

اور اس پر ظلم یہ بھی ہے کہ بے پردا ہے تو
سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو
خوف مستقبل ہے تو اندیشۂ فردا ہے تو

کاش اکدن یہ ترے ٹوٹے کنارے پھٹ پڑیں
کاش اکدن یہ تیرے خاموش دھارے پھٹ پڑیں

تیری موجیں ظالموں کے آستاں تک ہوں بلند
تیری لہریں غاصبوں کے اس مکاں تک ہوں بلند

جس مکاں میں تیری بربادی کے منصوبے ہوئے
جس کے کھمبے خون انسانی میں ہیں ڈوبے ہوئے

ظلم کے دھارے سے ٹکرائے تری موج رواں
بحر و بر میں گونج اٹھے اک صدائے الاماں

کاش اک دن اس طرح غیظ و غضب میں آئے تو
جانب مغرب غلامی کو بہالے جائے تو

پھر وہی آزادیاں ہوں پھر وہی میخواریاں
پھر وہی دلشادیاں ہوں پھر وہی سرشاریاں

خود ہی ساقی خود ہی ساغر خود ہی میخانہ ہے تو
یا زوال و ارتقا کا ایک پیمانہ ہے تو

سچ بتا اے میری جمنا کیا وہی جمنا ہے تو

بینی مادھو رام ناتھ - اسٹیشنری و کاغذ مرچنٹ - امین آباد پارک لکھنؤ

شاعر اور اُس کا مذہب

حضرت وصل بلگرامی

(۱)

اے! کہ میں دنیا میں ہوں آزادِ بندِ قیل و قال — میری دنیا ہے جوانی، میری عقبیٰ ہے، جمال
عینِ فطرت ہے مری ہر فکر، میرا ہر خیال — میری ہر اک سانس میں پنہاں ہے حسنِ لازوال
سینۂ کونین میں دُکھتا ہوا چھالا ہوں میں
تنگنائے سبحہ و زنار سے بالا ہوں میں

(۲)

میری ہر جنبش سے آتا ہے جہاں میں انقلاب — میری فردوسِ نظر میں ہے عالمِ شعر و شباب
میرا مندر ہے گلستاں میری مسجد ہے گلاب — دین کا میرے صحیفہ ہے، دمکتا آفتاب
ایک اک ذرّہ ہے وقفِ دلبری میرے لئے
صبح کے جلوؤں میں ہے، پیغمبری میرے لئے

(۳)

حُبِّ انسانی میں ہے میرا گریباں تار تار — میں کسی سے اپنے دل میں رکھ نہیں سکتا غبار
ایک ہے میرے لئے طغیانِ نور و سیلِ نار — دوست کیسے؟ مجھ کو تو دشمن پہ بھی آتا ہے پیار
ایک عالم سے انوکھا میرا ہر آئین ہے
آدمیت، میرا ایماں ہے، محبت، دین ہے

(۴)

آسماں ہے میرے قبضے میں زمیں زیرِ نگیں — طُور کا شعلہ ہے میرے واسطے گُل کی جبیں
مجھ کو ہر برگِ سبک ہے، شہ پرِ روح الامیں — رُتبہ لا محدود ہوں، محدود ہو سکتا نہیں
ایک میں، ویرانۂ کونین میں آباد ہوں
کیا ہوا کا ذکر، ایتھر کی طرح آزاد ہوں

(۵)

شب کے سنّاٹے میں جب ہوتی ہے جلووں کی نمود — بار پا جاتا ہے میری بزم میں، رازِ وجود
چھو نہیں سکتا مری سیماب حالی کو جمود — ٹھوکروں کی زد پہ رکھتا ہوں سرِ رسم و قیود
خاک سے، ہر صبح تا عرشِ بریں جاتا ہوں میں
اپنی آزادی پہ کیا کیا ناز فرماتا ہوں میں

(۶)

ہر جھلک، میری جھلک، ہر رنگ میرا رنگ ہے — خاک پر بھی مجھ کو لطفِ افسر و اورنگ ہے
فقر، اور پھر بادشاہی، ایک دنیا دنگ ہے — میرے دل کے سامنے، پہنائے عالم تنگ ہے
سرنگوں ہے زندگی کی روح میرے سامنے
کانپتی رہتی ہے عمرِ نوح میرے سامنے

(۷)

صبح ہے میری نگہ ہوں میں، نظامِ کیف و کم — زلزلوں کو میں سمجھتا ہوں صدائے زیر و بم
ناظرِ ہستی ہوں، اپنی تیز نظروں کی قسم — دیکھتا ہوں ایک اک قطرے کے اندر روحِ یم
آشنا ہوں کشورِ اسرار کی ہر بات سے
غیب کے عالم میں اک ہلچل ہے میری ذات سے

(۸)

کام جب لیتا ہوں شب کو قوتِ پرواز سے — دل دہل جاتا ہے گردوں کا مرے اعجاز سے
سوز کا طوفان آجاتا ہے میرے ساز سے — سانس رُک جاتی ہے تاروں کی مری آواز سے

آسماں سے جب اُترتا ہوں صدا دیتا ہوں میں
چونک اُٹھتا ہے چمن، انگڑائیاں لیتا ہوں میں

(۹)

ایک قطرہ ہوں مگر، صد بحر در آغوش ہوں
پستیوں میں ہوں مگر، صد آسماں بردوش ہوں
زمزمہ ہوں، ولولہ ہوں، غلغلہ ہوں، جوش ہوں
اتنے طوفانوں کا حامل ہوں، مگر خاموش ہوں
کیا زمیں، گردوں کو اپنا نقشِ پا کہتا ہوں میں
اور اتنی رفعتوں پر سرنگوں رہتا ہوں میں

(۱۰)

میری رگ رگ میں نہاں ہے ایک سیلِ آرزو
دل کو سرگرمِ سفر رکھتا ہے، ذوقِ جستجو
میری ہر موجِ نفس پر ہے، مدارِ رنگ و بُو
میری لے سے ہے رواں ہستی کی نبضوں میں لہو
چشمۂ حیواں ہوں میں، اس عالمِ ظلمات میں
دعوتیں سورج کو دیتا ہوں اندھیری رات میں

(۱۱)

گو گدائے خوار ہوں پھر بھی ہوں شاہِ بحر و بر
رشک کرتے ہیں سلاطیں آج میرے فقر پر
رات کو تارے ٹھٹک جاتے ہیں مجھ کو دیکھ کر
میری نظروں سے لچکتی ہے زمانے کی کمر
منہ حوادث کا اُتر جاتا ہے میرے سامنے
وقت کا پہیا، ٹھہر جاتا ہے، میرے سامنے

(۱۲)

ہاتھ میں رہتی ہے برق و بادکے، میری رکاب
قیدِ ماہ و سال سے آزاد ہے میرا شباب
جھومنے لگتی ہے دنیا، جب اُٹھاتا ہوں رباب
میرے ذرّوں سے دہکتا ہے، جمالِ آفتاب
آسماں جھکتا ہے میرے نقشِ پا کے سامنے
مسکراتی ہے خودی میرے خدا کے سامنے

(۱۳)

محفلیں دیکھی ہیں کیا کیا میرے دورِ جام نے ہر یقیں کا رنگ اُڑایا ہے مرے اوہام نے
دوڑتا ہے فلسفہ میری رکابیں تھامنے علم و ادب سے سر جھکا لیتا ہے میرے سامنے

جس قدر راہیں ہیں اس دنیا میں راہیں ہیں مری
کعبہ ہو، یا دیر، دونوں سیر گاہیں ہیں مری

بستۂ الہام رہتی ہے، مری شیریں زباں (۱۴) کیا بتاؤں، اپنے دل کی ہیں حیات افروزیاں
آبِ حیواں ہے، مرے کلکِ سبک رو سے رواں میرے حرفوں سے ٹپکتی ہے حیاتِ جاوداں

میرے جو جگائے ہوئے تا حشر سو سکتے نہیں
سو سمندر میرے اک نقطے کو دھو سکتے نہیں

ذرّے ذرّے میں ہے، روحِ لامکاں میرے لئے (۱۵) دہر کی ہر بے نشانی ہے نشاں میرے لئے
رفعتیں ہیں کارواں در کارواں میرے لئے مضطرب رہتی ہے، عمرِ جاوداں میرے لئے

مجھ سے رونق، حسنِ انسانی کے بازاروں میں ہے
دولتِ بیداد، خود میرے خریداروں میں ہے

میرے ہی ایما سے، آتی ہے زمانے میں بہار (۱۶) میرے ہی بربط کی دُھن پر چہچہاتے ہیں ہزار
مُنھ تکا کرتا ہے میرا، عشوۂ لیل و نہار میرا ہر تارِ نظر ہے، حسن کا پروردگار

شعلہ ہائے عارض و لب کو ہوا دیتا ہوں میں
حسن کو قابلِ پرستش کے بنا دیتا ہوں میں

میرے ہی دم سے ہے قائم لنترانی حسن کی (۱۷) میرا مرمٹنا ہی تو ہے، زندگانی حسن کی
تابع فرماں ہے میرے، حکمرانی حسن کی جاگتی ہے میری نظروں سے جوانی حسن کی

میں نویدِ زندگی ہوں مہ جبینوں کے لئے
اک ربوبیت کا مظہر ہوں حسینوں کے لئے

(۱۸)

میری رسوائی کے پردے میں ہے شہرت حسن کی
ناتوانی پر مری قائم ہے، قوت حسن کی
خاکساری پر مری ہنستی ہے نخوت حسن کی
میرے رخساروں کی زردی سے ہے زینت حسن کی
گرمیاں ہیں میرے ہی دم سے شرارِ حسن میں
میں نہ ہوں تو خاک اُڑ جائے دیارِ حسن میں

(۱۹)

محفلِ حرف و حکایت میں تکلم کی بہار
روحِ مطرب میں ہوں میں ساز و ترنم کی بہار
لعلِ جاں افروز پر، موجِ تبسم کی بہار
آسماں پر ہوں جمالِ ماہ و انجم کی بہار
طفل کے ہونٹوں پہ حرفِ لنترانی مجھ سے ہے
عارضِ آفاق پر، خونِ جوانی مجھ سے ہے

(۲۰)

رزم کے خونریز میدانوں میں ہوں شورِ جہاد
بزم کی رنگین بند پہ ہوں، لحنِ اتحاد
میری خدمات آج بھی تاریخِ عالم کو ہیں یاد
آج اگر طوفانِ صرصر ہوں تو کل بادِ مراد
میرے ہی قبضے میں ہے، رسم و رواجِ زندگی
مجھ سے بڑھ کر کون سمجھے گا مزاجِ زندگی

(۲۱)

با مسلماں اللہ اللہ، با برہمن، رام رام
کفر و ایماں سے کہیں بالا ہے میرا فیضِ عام
وہ برہمن ہوں، جسے اصنام کرتے ہیں سلام
میرے رتبے کو سمجھ اے مبتلائے عقلِ خام
روحِ پیرانِ حرم کو وجد میں لاتا ہوں میں
صبح کو، یوں دیر کی زنجیر کھٹکاتا ہوں میں

(٢٢)

خدمتِ نوعِ بشر کو میں سمجھتا ہوں نجات — میرے مذہب کے فرائض میں ہے تعمیرِ حیات
جو دلوں کے رُخ بدل دیتی ہے وہ کہتا ہوں بات — جنبشِ لب ہے، مرے آئین میں صوم و صلوٰۃ
دل میں سوز و ساز ہے لب پر خدا کا نام ہے
بس، یہی ہے کافری میری، یہی اسلام ہے

(٢٣)

جب کبھی قوموں پر آتی ہے بلائے ناگہاں — اُس گھڑی جوہر دکھاتی ہے مری تیغِ زباں
سانس سے اپنی گلا دیتا ہوں غم کی ہڈیاں — میری سرتابی بدل دیتی ہے آئینِ جہاں
سرحدِ مہر و محبت سے نکل جاتا ہوں میں
آہن و فولاد کے سانچے میں ڈھل جاتا ہوں میں

(٢٤)

مبتلائے کرب ہوں، انساں کی راحت کیلئے — ہر عمل میرا ہے، پیغامِ محبت کے لئے
وقف ہے ہر سانس میری آدمیت کیلئے — جاگتے سوتے کمربستہ ہوں خدمت کے لئے
سوز کے شعلے کو رقصِ ساز دے کر دیکھنا
وقت جب آئے مجھے آواز دے کر دیکھنا

(٢٥)

حکمراں جو میرے دل پر ہے وہ سلطاں اور ہے — جس کا میں قیدی ہوں وہ زلفِ پریشاں اور ہے
رقص کرتا ہوں جہاں میں، وہ شبستاں اور ہے — میرا ایماں اور ہے، دنیا کا ایماں اور ہے
وصل! سوزِ دل کجا و شورشِ ماتم کجا؟
مذہبِ شاعر کجا و مذہبِ عالم کجا؟

روحِ روانِ وطن

(از جناب شوکت تھانوی)

اے مرے پیارے وطن! اے خطۂ ہندوستان
میں تری روحِ رواں ہوں تو مری روحِ رواں

اے کہ تھا تو عظمتِ عالم نشانِ عز و شاں
اے کہ تو ہے ذلت و نکبت کی زندہ داستاں

زندگی تیری علمبردارِ عظمت تھی کبھی
اِک جہاں لرزہ میں تھا ایسی جلالت تھی کبھی

تیرے صحرا غیرتِ جنت تھے اے ہندوستاں
تیرے دریا تھے کبھی زمزم چکاں کوثر فشاں

خاک تیری میکدہ بر دوش و ساغر آفریں
اے وطن ہے تیرا ہر ذرہ پیمبر آفریں

کرشن کا جھولا ہے تو، گہوارۂ گوتم ہے تو
اور ہمالہ جس کا اِک تو ہے وہ عالم ہے تو

رام و لچھمن تیری خاکِ پاک سے پیدا ہوئے
اور یوں چمکے کہ چرخِ زیست کا تارا ہوئے

کیوں تصور خوشہ چینِ گلشنِ ماضی ہوا
میرے قلب و روح پر عالم عجب طاری ہوا

اے وطن یہ دیکھ ظرفِ تنگ کی پہنائیاں
حال و ماضی لے رہے ہیں قلب میں انگڑائیاں

تجھ سے میں پیدا ہوں پیارے اور مجھ سے تو عیاں
میں تری روحِ رواں ہوں تو مری روحِ رواں

اے مرے دلبر وطن! روحِ روانِ زندگی
خاک تیری اب بھی رکھتی ہے وہی تابندگی

خاک سے تیری جواہر سا جواں پیدا ہوا
شانِ مشرق عظمتِ ہندوستاں پیدا ہوا

لیکے انگڑائی فضا میں نور برسانے کو ہیں
کتنے ذرّے ہیں کہ جو خورشید بن جانے کو ہیں

شعلہ زن ہے ریشہ ریشہ میں وہ سوزِ انقلاب
جس کی خاکستر سے بنتے ہیں ہزاروں آفتاب

جو بدل دیتا ہے نقشہ اور شکل اقوام کی
مُہر ہے قرطاسِ آزادی پہ جس کے نام کی

ساقی و ساغر ہیں بیخود وجد پیمانے کو ہے — خون رگ رگ سے اُچھل کر بادہ بن جانے کو ہے
میکشانِ نو سے میخانہ جمالِ عید ہے — خشتِ خُم بھی آج صد رشکِ ہلالِ عید ہے
تیرا رِندِ بادہ کش اور ساری دنیا کا غلام — یہ تو ممکن ہی نہیں اے مایۂ مینا و جام
تجھ پہ اے رنگیں وطن قرباں ہو جائینگے ہم — تجھ کو گر کھویا تو اس عالم سے کھو جائینگے ہم

تو مری شوکت ہے اور میں تیری شوکت کا نشاں
میں تری روح رواں ہوں تو مری روحِ رواں

غزلیات

(جناب مولانا اصغر گونڈوی مدیر رسالۂ تماہی ہندوستانی ایکاڈمی الٰہ آباد)

کوئی محمل نشیں، کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غُبارِ قیس خود اُٹھتا ہے، خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ ہائے دام کیا؟ رنجِ اسیری کیا
چمن پر مِٹ گیا جو، ہر طرح آزاد ہوتا ہے

یہ سب ناآشنائے لذّتِ پرواز ہیں شاید
اسیروں میں ابھی تک شکوۂ صیّاد ہوتا ہے

بہارِ سبزہ و گل ہے، کرم ہوتا ہے ساقی کا
جواں ہوتے ہی دُنیا، میکدہ آباد ہوتا ہے

بنا لیتا ہے موجِ خونِ دِل سے اِک چمن اپنا
وہ پابندِ قفس، جو فطرۃً آزاد ہوتا ہے

بہار انجام سمجھوں اس چمن کا، یا خزاں سمجھوں؟
زبانِ برگِ گُل سے مجھکو کیا ارشاد ہوتا ہے

ازل میں اک تجلّی سے ہوئی تھی بیخودی طاری
تمھیں کو میں نے دیکھا تھا، کچھ ایسا یاد ہوتا ہے

سمائے جا رہے ہیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ہے؟ یا ذوقِ نظر برباد ہوتا ہے

زمانہ ہے کہ خُوگر ہو رہا ہے شور و شیون کا
یہاں وہ درد، جو بے نالہ و فریاد ہوتا ہے

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں! وہیں صیاد ہوتا ہے

یہاں مستوں کے سر الزام ہستی ہی نہیں اصغر
پھر اس کے بعد ہر الزام بے بنیاد ہوتا ہے

(جناب پربھو دیال صاحب اخگر ناطقی لکھنوی)

سینے میں قلبِ سوزاں کیا صدرِ انجمن ہے
مانندِ شمعِ روشن اک ایک موئے تن ہے

ہر سو محیطِ غم ہے ہر سانس پُر محن ہے
آپس کے تفرقے سے برہم یہ انجمن ہے

اِک داغ چھوڑ کر دلِ آوارۂ وطن ہے
برگِ خزاں رسیدہ گم کردۂ چمن ہے

خود حسن کو ازل میں تھی عشق کی تمنا
گل ہے فدائے بلبل کیا بھی اک چمن ہے

کیا ناخنِ حنائی کچھ ماند ہو چلے ہیں
ہر قطرہ خونِ دل کا سینے میں موجزن ہے

سُرخی ہے خونِ دل کی رگہائے گل کی صورت
قطرے میں آنسوؤں کے رنگینیِ چمن ہے

صیاد ہو موافق یا باغباں مخالف
پھر بھی قفس قفس ہے پھر بھی چمن چمن ہے

تارے بھی ہیں فلک پر موتی بھی بحر میں ہیں
اِک اشک ہے جو ابتک آوارۂ وطن ہے

یہ روح پھونک دی ہے قالب میں کس نے اخگر
رگ رگ میں خون کی جا بجلی سی موجزن ہے

(جناب اودھ کشور پرشاد صاحب گشتہ بی۔ ایل گیاوی تلمیذ حضرت نوح ناروی)

خدا کے واسطے سچ سچ بتا اے باغباں ہم سے
یہ تجھ سے گلستاں آباد ہے یا گلستاں ہم سے

عجب کیا آشیاں کے ساتھ چھوٹے گلستاں ہم سے
نظر آتی ہے اب بدلی نگاہِ باغباں ہم سے

چھپائے سے نہیں چھپتیں نہیں چھپتیں نہیں چھپتیں
تری چالاکیاں عیاریاں بےباکیاں ہم سے

بنا جب آشیاں گر کر اُسے فوراً جلا ڈالا
یہ کیسی گرم جوشی کر رہی ہیں بجلیاں ہم سے

کہاں جاتے ہو زندانِ وفا میں بیٹھ جاؤ بھی
یہی بس پاؤں پڑ کر کہہ رہی ہیں بیڑیاں ہم سے

جئیں تو اس کی خاطر ہم۔ مریں تو اسکی خاطر ہم — توقع رکھتی ہے یہ مادرِ ہندوستاں ہم سے
اس آسانی سے جھیلیں دل نے ایذائیں محبت کی — کہ گھبرانے لگیں زنداں کی ساری سختیاں ہم سے
قفس میں رہ کے بھی کیا کیا چمن کا دھیان آتا ہے — نہ چھوٹے آشیاں سے ہم نہ چھوٹا آشیاں ہم سے
بڑھائیں کیا قدم اپنا۔ اٹھائیں خاک سر اپنا — مکدر ہے زمیں ہم سے خفا ہے آسماں ہم سے
گریباں چاک کر کے اپنا دامن چاک کر ڈالا — اڑیں گی دیکھ لینا اب جنوں کی دھجیاں ہم سے

ہماری زندگی بھی موت سے بدتر ہے اے **کشتہ**
نہیں ہوتی اگر کچھ خدمتِ ہندوستاں ہم سے

(جناب سید ولایت حسین صاحب گہر لکھنوی)

اس طرح لوٹے گئے کوئی نشاں باقی نہیں — ہے مگر اپنی جگہ ہندوستاں باقی نہیں
پیکرِ بے روح میں تاب تواں باقی نہیں — دست و پا بے حس پڑے ہیں حکمراں باقی نہیں
منزلیں ویران کوئی میہماں باقی نہیں — کارواں کیسے نشانِ کارواں باقی نہیں
عشرت نظارہ کوئی آسماں باقی نہیں — انقلابوں کے سوا اب کچھ یہاں باقی نہیں
اب کہیں گنجائش آہ و فغاں باقی نہیں — نام لینے کو بھی جانِ ناتواں باقی نہیں
سلطنت وہ سلطنت دنیا کو جس پر ناز تھا — آج اُس کے تاجداروں کا نشاں باقی نہیں
صف شکن تیغ آزما وہ منچلے وہ سورما — وہ بہادر صاحبِ طبل و نشاں باقی نہیں
قید ہیں صرف آرزوئے قلب کے اظہار میں — جنبشیں لب میں نہیں زورِ بیاں باقی نہیں
وقف زنداں ہم ہوئے دل ہو گئے نذرِ وطن — جز فنا اب اور کوئی امتحاں باقی نہیں
چند پھولوں کے سوا بوئے وطن نابود ہے — کانٹے ہی کانٹے ہیں سب حُسنِ جہاں باقی نہیں

گنگا جل بیکار ہے جمنا کے درشن ہیں عبث
ہر ندی پایاب ہے آبِ رواں باقی نہیں

کھیتیاں سوکھی پڑی ہیں خشک سالی ہے کمال
آج کوئی دستگیرِ بیکساں باقی نہیں

رات دن اپنا کسانوں نے لہو پانی کیا
محنتیں بیکار ہیں جب قدرداں باقی نہیں

کانگریس او کانگریس ملک وطن کی یادگار
تیرے اجزائے پریشاں کے نشاں باقی نہیں

حوصلے کیوں پست ہیں کیوں تفرقے کیوں پھوٹ ہے
یا گلوں میں ہمتِ طوقِ گراں باقی نہیں

آج موتی لال زندہ ہیں نہ اجمل خاں حیات
کارواں تو ہے رئیسِ کارواں باقی نہیں

احتجاجی محفلیں ہیں نالہ و شیون ہے کیوں
وہ لہو وہ جوش وہ ہندوستاں باقی نہیں

فرقہ وارانہ تصادم ہو گیا ہے سدِّ راہ
وہ زمیں باقی نہیں وہ آسماں باقی نہیں

اتحادِ باہمی کی ہے ضرورت ملک میں
ختم ہے اب کوئی حرفِ داستاں باقی نہیں

مغربی پھولوں میں ایسے دل ہمارے جذب ہیں
انتہا یہ ہے کہ اب کوئی زباں باقی نہیں

وہ نہ دستورِ اساسی ہے نہ ترتیبِ عمل
کوئی عنواں، کوئی عنوانِ بیاں باقی نہیں

اے گہرؔ سچ تو یہ ہے اُبھرے تو کیا اُبھرے کوئی
حسرتیں مردہ ہوئیں تاب و تواں باقی نہیں

(جناب فخر الدین صاحب فرخؔ کانپوری)

ہر ذرہ اب وطن کا میرے لئے وطن ہے
ہر پھول اس چمن کا زینت دہِ چمن ہے

رونق ہو کیا چمن میں گلچیں ہے اور چمن ہے
کرنیں کہاں سے پھوٹیں سورج ہے اور گہن ہے

کیوں گل کی داستاں کا ہر صفحہ پر شکن ہے
وہ راز جانتا ہے جو واقفِ چمن ہے

مذہب کے فلسفہ کو تو آج تک نہ سمجھا
ان خانہ جنگیوں میں بربادیٔ وطن ہے

لے ایک ہے سبھوں کی اور راگ مختلف ہیں ‏— سازِ وطن میں کیسا یہ نغمۂ وطن ہے
تنکوں کا یہ تصادم دعوت ہے بجلیوں کو — اہلِ چمن تمہیں سے بربادیٔ چمن ہے
مشرق ہی سے ملی ہے مغرب کو روشنی یہ — جو چاند میں چمک ہے سورج کی وہ کرن ہے
پروانے کانگریس کے ہوتے رہیں گے قرباں — روشن اگر تو یوں ہی اے شمعِ انجمن ہے

سازِ غزل سے فرخ اک تازہ روح پھونکو
منصور کا ترانہ اب نغمۂ کہن ہے

(جناب شاکر ناطقی کانپوری)

پرورش کی ہے وطن نے یہ ہے احسانِ وطن — جان کیوں اپنی نہ دے صاحبِ ایمانِ وطن
واپس آئے ہیں جو زنداں سے غریبانِ وطن — اُن میں جو فرد ہے وہ صاحبِ کنعانِ وطن
مادرِ ہند کا وہ ایک بہادر فرزند — ہے بجا اس کو جو کہتے ہیں نگہبانِ وطن
فخر ہے ہم کو کہ ہم میں ہے جواہر سا جری — اور سب جسمِ وطن ہیں تو وہ ہے جانِ وطن
لالہ و گل کی قبائیں سرِ گلشن دیکھو — پوچھتے کیا ہو بہارِ چمنستانِ وطن
ملک سارا ہو غلام اور غلامی پہ ہو ناز — شان یہ اہلِ وطن کی ہے نہ شایانِ وطن
متحد ہو کے بڑھو ملک کی خدمت کیلئے — اب یہی فرض تمھارا ہے عزیزانِ وطن
دل میں ہر فرد کے اک جذبۂ آزادی ہو — ہے یہی جانِ وطن اور یہی ایمانِ وطن
صنعتِ ملک وہ شے ہے کہ نہیں حد جسکی — راز کو اس کے سمجھتے ہیں محبانِ وطن
دم غنیمت ہے بزرگوں کا سنو بات انکی — ملک کو تم سے ہے اُمید جوانانِ وطن
سعیٔ پیہم ہو تو گلشن میں پھر آجائے بہار — پھر نہ پامال خزاں سے ہو گلستانِ وطن

مر کے پائیں جو رہائی تو غنیمت سمجھو — ہوں کسی طرح تو آزاد غلامانِ وطن
یہ مسافر ہوئے کس طرح مقیم اس کو نہ پوچھ — میزباں اب ہیں وطن کے جو تھے مہمانِ وطن
آہ پروانوں میں یہ فرقہ پرستی کیسی — جل گئی دیکھ کے یہ شمعِ شبستانِ وطن
متحد ہو کے بہم عہد کی تجدید کریں — ورنہ بیکار ہے یہ مجمعِ ارکانِ وطن
مادرِ ہند کا انجام اسی رنگ میں ہے — ہوگا جس رنگ میں اخلاقِ جوانانِ وطن

جاں نثاروں کا یہاں عرس ہے آج اے شاکر
آئے چل کے سنیں ذکرِ شہیدانِ وطن

(جناب سیماب صاحب اکبرآبادی)

شکستہ پا ہوں، شریک اپنے کارواں میں نہیں — مرے نصیب کی گردش بھی آسماں میں نہیں
یہی تو قوتِ تحقیق، باغباں میں نہیں — کہاں گئیں وہ بہاریں، جو بوستاں میں نہیں
حواس جمع نہیں، ربطِ جسم و جاں میں نہیں — جو چاہتا ہوں وہ ترتیب کارواں میں نہیں
ہر ایک دل کو ہے دشوار معرفت میری — وہ راز ہوں جو ابھی ذہنِ رازداں میں نہیں
اسیرِ جذبۂ وحدت ہے فطرتاً انسان — سمجھ رہا ہے کہ مجھ سا کوئی جہاں میں نہیں
اچھالے دیتی ہے غمازیٔ نگاہ مجھے — میں راز بن کے بھی قابوئے رازداں میں نہیں
قفس کی قید سے چھوٹے بڑے زمانے میں — ہمارے وقت کا تنکا بھی آشیاں میں نہیں
درائے صبح کی آواز ہے نہ بانگِ جرس — خیال یہ ہے کہ میں اپنے کارواں میں نہیں
تعلقات کا رونا ہے، یاد کی فریاد — یہ جانتا ہوں کہ میں ذہنِ نوحہ خواں میں نہیں
وہاں ثبوتِ محبت کا دینے آیا ہوں — جہاں شریک فرشتے بھی امتحاں میں نہیں

خدا کا شکر ادا کر رہا ہوں غربت میں
کہ میرے پاؤں میں کانٹے بھی، زباں میں نہیں

میں چاہتا ہوں کہ منزل ہی منھ سے بول اُٹھے
فضا شناس کوئی میرے کارواں میں نہیں

جہانِ عشق کی مٹی خراب ہے سیماب
زمین تنگ ہے، گنجائش آسماں میں نہیں

حضرت جگر مرادآبادی

ایک رنگیں نقاب نے مارا
حسن بن کر حجاب نے مارا

جلوۂ آفتاب کیا کہیے؟
سایۂ آفتاب نے مارا

اپنے سینہ ہی پر پڑا اکثر
تیر، جو اضطراب نے مارا

نگہِ شوق و دعوئے دیدار
اس حجاب الحجاب نے مارا

ہم نہ مرتے تیرے تغافل سے
پرسشِ بے حساب نے مارا

لذّتِ دید بے جمال نہ پوچھ
دردِ بے اضطراب نے مارا

چھپتے ہیں اور چھپا نہیں جاتا
اس ادائے حجاب نے مارا

حشر تک ہم نہ مرنے والے کو
مرگِ ناکامیاب نے مارا

پاتے ہی اِک اشارۂ نازک
دم نہ بھر اضطراب نے مارا

دل، کہ تھا جانِ زیست، آہ جگر
اسی خانہ خراب نے مارا

ستمِ کامیاب نے مارا
کرمِ لاجواب نے مارا

خود ہوئی گُم، ہمیں بھی کھو بیٹھی
نگۂ باریاب نے مارا

زندگی تھی، حجاب کے دم تک
برہمیِ حجاب نے مارا

عشق کے ہر سکونِ آخر کو
حسن کے اضطراب نے مارا

خود نظر بن گئی حجابِ نظر
ہائے اس بے حجاب نے مارا

میں ترا عکس ہوں کہ تو میرا
اس سوال و جواب نے مارا

کوئی پوچھے کہ رہ کے پہلو میں
تیرا کیا اضطراب نے مارا

بچ رہا جو تری تجلی سے
اس کو تیرے حجاب نے مارا

اب نظر کو کہیں قرار نہیں
کاوشِ انتخاب نے مارا

سب کو مارا جگر کے شعروں نے
اور جگر کو شراب نے مارا

شورشِ کائنات نے مارا
موت بن کر حیات نے مارا

پرتوِ حسنِ ذات نے مارا
مجھ کو، میری صفات نے مارا

ستمِ یار کی دہائی ہے
نگہِ التفات نے مارا

میں تمھارا رازِ حیات اور مجھے
میرے رازِ حیات نے مارا

ستمِ زیست آفریں کی قسم
خطرۂ التفات نے مارا

موت کیا؟ ایک لفظِ بے معنی
جس کو مارا، حیات نے مارا

جو پڑی دل پہ سہہ گئے لیکن
ایک نازک سی بات نے مارا

شکوۂ موت کیا کریں کہ جگر
آرزوئے حیات نے مارا